خالی بوتلیں، خالی ڈبے

سعادت حسن منٹو

زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے، چھوا ہے، چکھا ہے

سماج کے فاسد مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے۔ کرشن چندر

خالی بوتلیں، خالی ڈبے

''منٹو نہ تو کسی کو شرم دلاتا ہے نہ کسی کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے ، وہ تو بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ انوں سے یہ کہتا ہے کہ تم اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دور نہیں جا سکتے ۔ اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر کہیں زیادہ بھروسا نظر آتا ہے ۔ ''

محمد حسن عسکری

''منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے ، چھؤا ہے ، چکھا ہے ۔ اور اب وہ ایک تیز نشتر بن کر سماج کے فاسد مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے ۔ مریض چیختا ہے ، چلاتا ہے ، بین کرتا ہے ۔ منٹو کو اس کی پروا نہیں ۔ وہ اس قدر بے رحم ہے کہ کلوروفارم دینا بھی پسند نہیں کرتا ۔ ''

کرشن چندر

''منٹو آدم کی جرأتِ گناہ کا قائل ہے ۔ منٹو کا انسان نوری ہے نہ ناری ۔ وہ آدمِ خاکی ہے — وہ وجودِ خاکی جس میں بنیادی گناہ ، فساد ، قتل و خون وغیرہ کے امکان کے باوجود ، خدا نے نوری فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں ۔''

ممتاز شیریں

خالی بوتلیں
خالی ڈبّے

(افسانے)

سعادت حسن منٹو

البیان

چوک انارکلی لاہور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ
زندہ کتابیں میں پہلی مرتبہ، ۱۹۶۶ء
ناشر:- محمد حنیف رامے
البیان، چوک انار کلی لاہور
طابع، اشرف پریس، لاہور

ترتیب

خالی بوتلیں، خالی ڈبّے، ۹
سہاسے، ۲۳
"ٹوٹو" ۳۷
رام کھلاون، ۴۹
بسم اللہ، ۶۳
شانتی، ۸۷
خالد میاں، ۱۰۲
دو قومیں، ۱۱۹
مجید کا ماضی، ۱۲۳
حامد کا بچہ، ۱۴۷
لائسنس، ۱۶۳
کتاب کا خلاصہ، ۱۷۷

پیش لفظ

جیسا کہ پہلے اعلان کیا گیا تھا یہ کتاب میرے افسانوں اور مضمونوں کا مخلوط مجموعہ تھی مگر جب مسودہ کاتب کے سپرد کیا جانے لگا تو میں نے سوچا افسانوں اور مضمونوں کا جوڑ کچھ ٹھیک نہیں۔ چنانچہ میں نے مضامین نکال لیے اور ان کی جگہ نئے افسانے لکھ دیئے۔

ان نئے افسانوں میں کچھ مطبوعہ ہیں کچھ غیر مطبوعہ۔ ان کی خصوصیت علاوہ اس کے کہ یہ میرے لکھے ہوئے ہیں یہ ہے کہ ہر افسانہ ایک ہی نشست میں لکھا گیا ہے۔ یہ افسانے میرے پہلے افسانوں سے کسی قدر مختلف ہوں گے۔ ان میں الفاظ بقدرِ کفایت استعمال کیے گئے ہیں۔ فروعی تفصیلات سے پرہیز کیا گیا ہے۔ یہ امر ملحوظِ خاطر رہا ہے کہ کم سے

کم الفاظ میں حرفِ مدعا بیان ہو جائے۔ میرا خیال ہے مجھے اس میں کامیابی ہوئی ہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھنا ہے کہ پڑھنے والوں کا ردِّعمل کیا ہے۔

لاہور، ۲۶۔ اگست ۱۹۵۰ء

سعادت حسن منٹو

خالی بوتلیں، خالی ڈبّے

یہ حیرت مجھے اب بھی ہے کہ خاص طور پر خالی بوتلوں اور ڈبّوں سے مجرّد مردوں کو اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے؟ —— مجرّد مردوں سے میری مُراد ان مردوں سے ہے جن کو عام طور پر شادی سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

یوں تو اس قسم کے مرد عموماً سنکی اور عجیب و غریب عادات کے مالک ہوتے ہیں، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انہیں خالی بوتلوں اور ڈبّوں سے کیوں اتنا پیار ہوتا ہے؟ —— پرندے اور جانور اکثر ان لوگوں کے پالتو جانور رہتے ہیں۔ یہ میلان سمجھ میں آسکتا ہے کہ تنہائی میں اُن کا کوئی تو مونس ہونا چاہیئے، لیکن خالی بوتلیں اور خالی ڈبّے ان کی کیا غم گساری کر سکتے ہیں؟

سنک اور عجیب و غریب عادات کا جواز ڈھونڈنا کوئی مشکل نہیں کہ فطرت کی خلاف

خالی تو تا ہیں خالی ڈبے

دوری ایسے بگاڑ پیدا کر سکتی ہے، لیکن اس کی نفسیاتی باریکیوں میں جانا البتہ بہت مشکل ہے۔

میرے ایک عزیز ہیں۔ عمر آپ کی اس وقت پچاس کے قریب ہے۔ آپ کو کبوتر اور کتے پالنے کا شوق ہے اور اس میں کوئی عجیب و غریب پن نہیں لیکن آپ کو یہ مرض ہے کہ بازار سے ہر روز دودھ کی بالائی خرید کر لاتے ہیں، چولہے پہ رکھ کر اس کا روغن نکال لیتے ہیں اور اس روغن میں اپنے لیے علیحدہ سالن تیار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح خالص گھی تیار ہوتا ہے۔

پانی پینے کے لیے اپنا گھڑا الگ رکھتے ہیں۔ اس کے منہ پر ہمیشہ ململ کا ٹکڑا بندھا رہتا ہے تاکہ کوئی کیڑا مکوڑہ اندر نہ چلا جائے، مگر ہوا برابر داخل ہوتی رہے پاخانے جاتے وقت سب کپڑے اتار کر ایک چھوٹا سا تولیہ باندھ لیتے ہیں اور لکڑی کی کھڑاؤں پہن لیتے ہیں ——— اب کوئی ان کی بالائی کے روغن، گھڑے کی ململ، اس کے تولیے اور لکڑی کی کھڑاؤں کے نفسیاتی عقدے کو حل کرنے بیٹھے!

میرے ایک مجرد دوست ہیں۔ بظاہر بڑے ہی نورمل انسان۔ ہائی کورٹ میں کورٹ ریڈر ہیں۔ آپ کو ہر جگہ سے ہر وقت بدبو آتی رہتی ہے۔ چنانچہ ان کا رومال سدا ان کی ناک سے چپکا رہتا ہے ——— آپ کو خرگوش پالنے کا شوق ہے

ایک اور مجرد ہیں۔ آپ کو جب موقع ملے تو نماز پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا دماغ بالکل صحیح ہے بیاسیات عالم پر آپ کی نظر بہت وسیع ہے

طوطوں کو باتیں سکھانے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔

ملٹری کے ایک میجر ہیں سن رسیدہ اور دولت مند۔ آپ کو حُقّے جمع کرنے کا شوق ہے۔ گڑگڑیاں، پیچوان، حموڑے، غرض کہ ہر قسم کا حُقّہ ان کے پاس موجود ہے۔ آپ کئی مکانوں کے مالک ہیں، مگر ہوٹل میں ایک کمرہ کرایے پر لے کر رہتے ہیں۔ بٹیریں آپ کی جان ہیں۔

ایک کرنل صاحب ہیں۔ ریٹائرڈ۔ بہت بڑی کوٹھی میں اکیلے دس بارہ چھوٹے بڑے کتوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ ہر برانڈ کی وسکی ان کے یہاں موجود رہتی ہے۔ ہر روز شام کو چار پگ پیتے ہیں اور اپنے ساتھ کسی نہ کسی لاڈلے کتے کو بھی پلاتے ہیں۔

میں نے اب تک جتنے مجرّدوں کا ذکر کیا ہے، ان سب کو حسب توفیق خالی بوتلوں اور ڈبوں سے دل چسپی ہے۔ میرے، دودھ کی بالائی سے خالص گھی تیار کرنے والے عزیز، گھر میں جب بھی کوئی خالی بوتل دیکھیں تو اسے دھو دھا کر اپنی الماری میں سجا دیتے ہیں کہ ضرورت کے وقت کام آئے گی۔ ہائی کورٹ کے ریڈر جن کو ہر جگہ سے ہر وقت بدبو آتی رہتی ہے، صرف ایسی بوتلیں اور ڈبّے جمع کرتے ہیں جن کے متعلق وہ اپنا پورا اطمینان کر لیں کہ اب ان سے بدبو آنے کا کوئی احتمال نہیں رہا۔ جب موقع ملے، نماز پڑھنے والے، خالی بوتلیں آب دست کے لیے اور ٹین کے خالی ڈبّے وضو کے لیے درجنوں کی تعداد میں جمع رکھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق یہ دونوں چیزیں سستی اور پاکیزہ رہتی ہیں ——— قسم قسم کے حُقّے جمع

خالی بوتلیں خالی ڈبے

کرنے والے میجر صاحب کو خالی بوتلیں اور خالی ڈبے جمع کر کے ان کو بیچنے کا شوق، اور ریٹائرڈ کرنل صاحب کو صرف وہسکی کی خالی بوتلیں جمع کرنے کا۔

آپ کرنل صاحب کے ہاں جائیں تو ایک چھوٹے، صاف ستھرے کمرے میں کئی شیشے کی الماریوں میں آپ کو وہسکی کی خالی بوتلیں سجی ہوئی نظر آئیں گی ——— پرانے سے پرانے برانڈ کی وہسکی کی خالی بوتل بھی آپ کو ان کے اس نادر مجموعے میں مل جائے گی جس طرح لوگوں کو ٹکٹ اور سکے جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے اسی طرح ان کو وسکی کی خالی بوتلیں جمع کرنے اور ان کی نمائش کرنے کا شوق بلکہ خبط ہے۔

کرنل صاحب کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں۔ کوئی ہے تو اس کا مجھے علم نہیں۔ دُنیا میں تن تنہا ہیں۔ لیکن وہ تنہائی بالکل محسُوس نہیں کرتے ——— وسِ ادارہ گھتے ہیں ان کی دیکھ بھال وہ اس طرح کرتے ہیں جس طرح شفیق باپ اپنی اولاد کی کرتے ہیں۔ سارا دن ان کا ان پالتو حیوانوں کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ فرصت کے وقت وہ الماریوں میں اپنی چہیتی بوتلیں سنوارتے رہتے ہیں۔

آپ پوچھیں گے، خالی بوتلیں تو ہو ہیں، یہ تم نے خالی ڈبے کیوں ساتھ لگا دیئے؟ ——— کیا یہ ضروری ہے کہ تجرّد پسند مردوں کو خالی بوتلوں کے ساتھ ساتھ خالی ڈبوں کے ساتھ بھی دل چسپی ہو؟ ——— اور پھر ڈبے اور بوتلیں صرف خالی کیوں؟ بھری ہوئی کیوں نہیں؟ ——— میں شاید آپ سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مجھے خود اس بات کی حیرت ہے۔ یہ اور اسی قسم کے اور بہت سے سوال اکثر میرے

دماغ میں پیدا ہو چکے ہیں۔ باوجود کوشش کے میں ان کا جواب حاصل نہیں کر سکا۔

خالی بوتلیں اور خالی ڈبے، خلا کا نشان ہیں اور خلا کا کوئی منطقی جوڑ مجرد پسند مردوں سے غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ خود ان کی زندگی میں ایک خلا ہوتا ہے، لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا وہ اس خلا کو ایک اور خلا سے پُر کرتے ہیں؟ ——— کتّوں، بلیوں خرگوشوں اور بندروں کے متعلق آدمی سمجھ سکتا ہے کہ وہ خالی خولی زندگی کی کمی ایک حد تک پوری کر سکتے ہیں کہ وہ دل بہلا سکتے ہیں، ناز نخرے کر سکتے ہیں، دلچسپ حرکات کے موجب ہو سکتے ہیں، پیار کا جواب بھی دے سکتے ہیں۔ لیکن خالی بوتلیں اور ڈبے دلچسپی کا کیا سامان بہم پہنچا سکتے ہیں؟

بہت ممکن ہے کہ آپ کو ذیل کے واقعات میں ان سوالوں کا جواب مل جائے۔

دس برس پہلے میں جب بمبئی گیا تو وہاں ایک مشہور فلم کمپنی کا ایک فلم تقریباً بیس ہفتوں سے چل رہا تھا ——— ہیروئن پرانی تھی، لیکن ہیرو نیا تھا جو اشتہاروں میں چھپی ہوئی تصویروں میں نوخیز دکھائی دیتا تھا۔ اخباروں میں اس کی کردار نگاری کی تعریف پڑھی تو میں نے یہ فلم دیکھا۔ اچھا خاصا تھا۔ کہانی جاذب توجہ تھی اور اس نے ہیرو کا کام بھی اس لحاظ سے قابلِ تعریف تھا کہ اس نے پہلی مرتبہ کیمرے کا سامنا کیا تھا۔

پردے پر کسی ایکٹر یا ایکٹرس کی عمر کا اندازہ لگانا عام طور پر مشکل ہوتا ہے کیونکہ

میک اَپ جوان کو بوڑھا اور بوڑھے کو جوان بنا دیتا ہے، مگر یہ نیا ہیرو بلاشبہ نوخیز تھا ـــــــ کالج کے طالب علم کی طرح تروتازہ اور چاق وچوبند ـــ خوبصورت تو نہیں تھا مگر اس کے گٹھے ہوئے جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر مناسب و موزوں تھا۔

اس فلم کے بعد اس ایکٹر کے میں نے اور کئی فلم دیکھے ـــ اب وہ منجھ گیا تھا ـــ چہرے کے خط و خال کی طفلانہ زیبائش، عمر اور تجربے کی سختی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کا شمار اب چوٹی کے اداکاروں میں ہونے لگا تھا۔

فلمی دنیا میں اسکینڈل عام ہوتے ہیں۔ آئے دن سننے میں آتا ہے کہ فلاں ایکٹر کا فلاں ایکٹرس سے تعلق ہو گیا ہے، فلاں ایکٹرس، فلاں ایکٹر کو چھوڑ کر فلاں ڈائریکٹر کے پہلو میں چلی گئی ہے۔ قریب قریب ہر ایکٹر اور ہر ایکٹرس کے ساتھ کوئی نہ کوئی رومان جلد یا بدیر وابستہ ہو جاتا ہے، لیکن اس نئے ہیرو کی زندگی جس کا میں ذکر کر رہا ہوں ان بکھیڑوں سے پاک تھی، مگر اخباروں میں اس کا چرچا نہیں تھا۔ کسی نے بھولے سے حیرت کا بھی اظہار نہیں تھا کہ فلمی دُنیا میں رہ کر رام سروپ کی زندگی جنسی آلائشوں سے پاک ہے۔

میں نے سچ پوچھئے تو اس بارے میں کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس لیے کہ مجھے ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی نجی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فلم دیکھا، اس کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کی اور بس ـــــــ لیکن جب رام سروپ سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے اس کے متعلق بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں ـــــ یہ ملاقات اس کا پہلا فلم دیکھنے کے تقریباً آٹھ برس بعد ہوئی۔

شروع شروع میں تو وہ بمبئی سے بہت دور ایک گاؤں میں رہتا تھا، مگر اب فلمی سرگرمیاں بڑھ جانے کے باعث اس نے شیواجی پارک میں سمندر کے کنارے ایک متوسط درجے کا فلیٹ لے رکھا تھا۔ اس سے میری ملاقات اسی فلیٹ میں ہوئی جس کے چار کمرے تھے، باورچی خانے سمیت۔

اس فلیٹ میں جو کنبہ رہتا تھا۔ اس کے آٹھ افراد تھے بجز رام سروپ، اس کا نوکر جو باورچی بھی تھا، تین کتے، دو بندر اور ایک بلی۔ رام سروپ اور اس کا نوکر مجرّد تھے۔ تین کتوں اور ایک بلی کے مقابلے میں ان کی مخالف جنس نہیں تھی؛ ——— ایک بندر تھا اور ایک بندریا۔ دونوں اکثر اوقات ایک جالی دار پنجرے میں بند رہتے تھے۔

ان نصف درجن حیوانوں کے ساتھ رام سروپ کو والہانہ محبت تھی۔ نوکر کے ساتھ بھی اس کا سلوک بہت اچھا تھا مگر اس میں جذبات کا دخل بہت کم تھا۔ بگنے بندھے کام تھے جو مقررہ وقت پر مشین کی سی بے روح باقاعدگی کے ساتھ گویا خود بخود ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رام سروپ نے اپنے نوکر کو اپنی زندگی کے تمام قواعد وضوابط ایک پرچے پر لکھ کر دے دیے تھے، جو اس نے حفظ کر لیے تھے۔

اگر رام سروپ کپڑے اتار کر، نیکر پہننے لگے تو اس کا نوکر فوراً تین چار سوڈے اور برف کی فلاسک شیشے والی تپائی پر رکھ دیتا تھا ——— اس کا مطلب یہ تھا کہ صاحب رم پی کر اپنے کتوں کے ساتھ کھیلیں گے اور جب کسی کا ٹیلی فون آئیگا

تو کہہ دیا جائے گا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔

رم کی بوتل یا سگریٹ کا ڈبہ جب خالی ہو گا تو اسے پھینکا یا بیچا نہیں جائے گا، بلکہ احتیاط سے اس کمرے میں رکھ دیا جائے گا جہاں خالی بوتلوں اور ڈبوں کے انبار لگے ہیں۔

کوئی عورت ملنے کے لیے آئے گی تو اسے دروازے ہی سے یہ کہہ کر واپس کر دیا جائے گا کہ رات صاحب کی شوٹنگ تھی، اس لیے سو رہے ہیں۔ ملاقات کرنے والی شام کو یا رات کو آئے تو اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب شوٹنگ پر گئے ہیں۔

رام سروپ کا گھر تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ عام طور پر اکیلے رہنے والے مجرد مردوں کا ہوتا ہے یعنی وہ سلیقہ، قرینہ اور رکھ رکھاؤ غائب تھا جو نسائی لمس کا خاصا ہوتا ہے۔ صفائی تھی مگر اس میں کھردرا پن تھا —— پہلی مرتبہ جب میں اس کے فلیٹ میں داخل ہوا تو مجھے بہت شدت سے محسوس ہوا کہ میں چڑیا گھر کے اس حصے میں داخل ہو گیا ہوں جو شیر، چیتے اور دوسرے حیوانوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے کیونکہ ویسی ہی بو آ رہی تھی۔

ایک کمرہ سونے کا تھا۔ دوسرا بیٹھنے کا، تیسرا خالی بوتلوں اور ڈبوں کا۔ اس میں رم کی وہ تمام بوتلیں اور سگریٹ کے وہ تمام ڈبے موجود تھے جو رام سروپ نے پی کر خالی کیے تھے۔ کوئی اہتمام نہیں تھا۔ بوتلوں پر ڈبے اور ڈبوں پر بوتلیں اوندھی سیدھی

پڑی ہیں۔ ایک کونے میں قطار لگی ہے، تو دوسرے کونے میں انبار۔ گرد جمی ہوئی ہے اور باسی تمباکو اور باسی رَم کی ملی جلی تیز بُو آ رہی ہے۔

میں نے جب پہلی مرتبہ یہ کمرہ دیکھا تو بہت حیران ہوا۔ ان گنت بوتلیں اور ڈبّے تھے ——— سب خالی۔ میں نے رام سروپ سے پوچھا: "کیوں بھئی، یہ کیا سلسلہ ہے؟"

اس نے پوچھا: "کیسا سلسلہ؟"

میں نے کہا: "یہ ——— یہ کباڑ خانہ؟"

اس نے صرف اتنا کہا: "جمع ہو گیا ہے!"

یہ سن کر میں نے بولتے ہوئے سوچا: "اتنا؟ .... اتنا کوڑا جمع ہونے میں کم از کم سات آٹھ برس چاہئیں!"

میرا اندازہ غلط نکلا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا یہ ذخیرہ پورے دس برس کا تھا۔ جب وہ شیواجی پارک رہنے آیا تھا تو وہ تمام بوتلیں اور ڈبّے اٹھوا کے اپنے ساتھ لے آیا تھا جو اس کے پرانے مکان میں جمع ہو چکے تھے۔ ایک بار میں نے اس سے کہا: "سروپ، تم یہ بوتلیں اور ڈبّے بیچ کیوں نہیں دیتے؟ میرا مطلب ہے، اوّل تو ساتھ ساتھ بیچتے رہنا چاہئیں ——— پر اب کہ اتنا انبار جمع ہو چکا ہے اور جنگ کے باعث دام بھی اچھے مل سکتے ہیں، میں سمجھتا ہوں تمہیں یہ کباڑ خانہ اٹھوا دینا چاہیے!"

خالی بوتلیں خالی ڈبے

اس نے جواب میں صرف اتنا کہا: "ہٹاؤ یار ——— کون اتنی بک بک کرے"
اس جواب سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے خالی بوتلوں اور ڈبوں سے کوئی دلچسپی نہیں، لیکن مجھے نوکر سے معلوم ہوا کہ اگر اس کمرے میں کوئی بوتل یا ڈبہ ادھر کا اُدھر ہوجائے تو رام سروپ قیامت برپا کردیتا تھا۔

عورت سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میری اس کی بہت بے تکلفی ہوگئی تھی۔ باتوں باتوں میں، میں نے کئی بار اس سے دریافت کیا: "کیوں بھئی شادی کب کروگے؟" اور ہر بار اس قسم کا جواب ملا: "شادی کرکے کیا کروں گا؟" میں نے سوچا، واقعی رام سروپ شادی کرکے کیا کرے گا؟ ——— کیا وہ اپنی بیوی کو خالی بوتلوں اور ڈبوں والے کمرے میں بند کردے گا؟ ——— یا سب کپڑے اُتار، نیکر پہن کر رم پیتے اس کے ساتھ کھیلا کرے گا؟ ——— میں اس سے شادی بیاہ کا ذکر تو اکثر کرتا تھا مگر تصور پر زور دینے کے باوجود اسے کسی عورت سے ملوث نہ دیکھ سکتا۔

رام سروپ سے ملتے ملتے کئی برس گزر گئے۔ اس دوران میں کئی مرتبہ میں نے اُڑتی اُڑتی سنی کہ لسے ایک ایکٹرس سے جس کا نام شیلا تھا عشق ہوگیا ہے۔ مجھے اس افواہ کا بالکل یقین نہ آیا۔ اوّل تو رام سروپ سے اس کی توقع ہی نہیں تھی، دوسرے شیلا سے کسی بھی ہوش مند نوجوان کو عشق نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ وہ اس قدر بے جان تھی کہ دق کی مریض معلوم ہوتی تھی ——— شروع شروع میں جب وہ ایک دو فلموں

میں آئی تھی تو کسی قدر گوارا تھی مگر بعد میں تو وہ بالکل ہی بے کیف اور بے رنگ ہو گئی تھی، اور صرف تیسرے درجے کے فلموں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی تھی۔

میں نے صرف ایک مرتبہ اس شیلا کے بارے میں رام سروپ سے دریافت کیا تو اس نے مسکرا کر کہا "میرے لیے کیا یہی رہ گئی تھی؟"

اس دوران میں اس کا سب سے پیارا کتا اسٹالن نمونیا میں گرفتار ہو گیا اور رام سروپ نے دن رات بڑی جانفشانی سے اس کا علاج کیا مگر وہ جانبر نہ ہوا۔ اس کی موت سے اسے بہت صدمہ ہوا۔ کئی دن اس کی آنکھیں اشک آلود رہیں۔ اور جب اس نے ایک روز باقی کتے کسی دوست کو دے دیے تو میں نے خیال کیا کہ اس نے اسٹالن کی موت کے صدمے کے باعث ایسا کیا ہے ورنہ وہ ان کی جدائی کبھی برداشت نہ کرتا۔

کچھ عرصے کے بعد جب اس نے بندر اور بندریا کو بھی رخصت کر دیا تو مجھے کسی قدر حیرت ہوئی، لیکن میں نے سوچا کہ اس کا دل اب اور کسی کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کرنا چاہتا تھا، اب وہ نیکر بہن کر رم پیتے ہوئے صرف اپنی بلّی نرگس سے کھیلتا تھا۔ وہ بھی اس سے بہت پیار کرنے لگی تھی کیونکہ رام سروپ کا سارا التفات اب اسی کے لیے موقوف ہو گیا تھا۔

اب اس کے گھر سے شیر چیتوں کی بو نہیں آتی تھی صفائی میں کسی قدر نظر آ جانے والا سلیقہ اور قرینہ بھی پیدا ہو چلا تھا، اس کے اپنے چہرے پر ہلکا سا نکھار

آگیا تھا۔ مگر یہ سب کچھ اس قدر آہستہ آہستہ ہوا تھا کہ اس کے نقطۂ آغاز کا پتا چلانا بہت مشکل تھا۔

دن گزرتے گئے۔ رام سروپ کا تازہ فلم ریلیز ہوا تو میں نے اس کی کردار نگاری میں ایک نئی تازگی دیکھی۔ میں نے اسے مبارک باد دی تو وہ مسکرا دیا: "لو، وسکی پیو!"

میں نے تعجب سے پوچھا: "وسکی؟" اس لیے کہ وہ صرف رم پینے کا عادی تھا۔

پہلی مسکراہٹ کو ہونٹوں میں ذرا اسکیڑتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"رم پی پی کر تنگ آگیا ہوں"

میں نے اس سے اور کچھ نہ پوچھا۔

آٹھویں روز میں جب اس کے ہاں شام کو گیا تو وہ قمیص پائجامہ پہنے رم — نہیں، وسکی پی رہا تھا — دیر تک ہم تاش کھیلتے اور وسکی پیتے رہے۔ اس دوران میں، میں نے نوٹ کیا کہ وسکی کا ذائقہ اس کی زبان اور تالو پر ٹھیک نہیں بیٹھ رہا کیونکہ گھونٹ بھرنے کے بعد وہ کچھ اس طرح منہ بناتا تھا جیسے کسی اَن چکھی چیز سے اس کا واسطہ پڑا ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا: "تمہاری طبیعت قبول نہیں کر رہی وسکی کو؟"

اس نے مسکرا کر جواب دیا: "آہستہ آہستہ قبول کرے گی۔"

رام سروپ کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا۔ ایک روز میں ادھر سے گزر رہا تھا کہ دیکھا نیچے گیراج کے پاس خالی بوتلوں اور ڈبوں کے انبار کے انبار پڑے ہیں۔ سڑک پر

دو چھکڑے کھڑے ہیں جن میں تین چار کباڑیے ان کو لاد رہے ہیں۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کیونکہ یہ خزانہ رام سروپ کے علاوہ اور کس کا ہو سکتا تھا۔ آپ یقین جانیئے کہ اس کو جدا ہوتے دیکھ کر میں نے اپنے دل میں ایک عجیب قسم کا درد محسوس کیا ——— دوڑا اوپر گیا۔ گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا۔ میں نے اندر داخل ہونا چاہا تو نوکر نے خلافِ معمول راستہ روکتے ہوئے کہا: "صاحب رات شوٹنگ پر گئے تھے اس وقت سو رہے ہیں۔"

میں حیرت سے اور غصّے سے بوکھلا گیا ——— کچھ بڑبڑایا اور چل دیا۔

اسی روز شام کو رام سروپ میرے ہاں آیا ——— اس کے ساتھ شیلا تھی۔ نئی بنارسی ساڑھی میں ملبوس ——— رام سروپ نے اس کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا: "میری دھرم پتنی سے ملو۔"

اگر میں نے وسکی کے چار پیگ نہ پیئے ہوتے تو یقیناً یہ سن کر بیہوش ہو گیا ہوتا۔

رام سروپ اور شیلا صرف تھوڑی دیر بیٹھے اور چلے گئے۔ میں دیر تک سوچتا رہا کہ بنارسی ساڑھی میں شیلا کس سے مشابہ تھی۔ دُبلے پتلے بدن پر ہلکے بادامی رنگ کی کاغذی سی ساڑھی، کسی جگہ پھولی ہوئی، کسی جگہ دبی ہوئی ——— ایک دم میری آنکھوں کے سامنے ایک خالی بوتل آ گئی، باریک کاغذ میں لپٹی ہوئی۔

شیلا عورت تھی ——— بالکل خالی، لیکن ہو سکتا ہے ایک خلا نے دوسرے خلا کو پُر کر دیا ہو۔

سہائے

"یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں ـــــ یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں ـــــ اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں، ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے۔ ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا ہے، لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمان قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہونگی کہ اسلام ختم ہو گیا ہے، مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی ـــــ وہ لوگ بے وقوف ہیں جو سمجھتے ہیں کہ بندوقوں سے مذہب شکار کیے جا سکتے ہیں ـــــ مذہب، دین، ایمان، دھرم، یقین، عقیدت ـــــ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم میں نہیں، رُوح میں ہوتا

ہے ـــــ چھرے اچا قو اور گولی سے۔ یہ کیسے فنا ہو سکتا ہے؟"
ممتاز اس روز بہت ہی پرجوش تھا۔ ہم صرف تین تھے جو اسے جہاز پر چھوڑنے کے لیے آئے تھے ـــــ وہ ایک غیر متعین عرصے کے لیے ہم سے جدا ہو کر پاکستان جا رہا تھا ـــــ پاکستان جس کے وجود کے متعلق ہم میں سے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ہم تینوں ہندو تھے مغربی پنجاب میں ہمارے رشتہ داروں کو بہت مالی اور جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ممتاز ہم سے جدا ہو رہا تھا جگل کو لاہور سے خط ملا کہ فسادات میں اس کا چچا مارا گیا ہے۔ تو اس کو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اسی صدمے کے زیر اثر باتوں باتوں میں ایک دن اس نے ممتاز سے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں اگر ہمارے محلے میں فساد شروع ہو جاتے تو میں کیا کر ڈالتا"

ممتاز نے اس سے پوچھا۔ "کیا کر دیتے؟"

جگل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "میں سوچ رہا ہوں، بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں"

یہ سن کر ممتاز بالکل خاموش ہو گیا اور اس کی یہ خاموشی تقریباً آٹھ روز تک قائم رہی اور اس وقت ٹوٹی جب اس نے اچانک ہمیں بتایا کہ وہ پونے چار بجے سمندری جہاز سے کراچی جا رہا ہے۔

ہم تینوں میں سے کسی نے اس کے اس ارادے کے متعلق بات چیت نہ

کی جنگل کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ ممتاز کی روانگی کا باعث اس کا یہ جملہ ہے "میں سوچ رہا ہوں، بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں"۔ غالباً وہ اب تک یہی سوچ رہا تھا کہ وہ مشتعل ہو کر ممتاز کو مار سکتا ہے یا نہیں ——— ممتاز کو جو کہ اس کا جگری دوست تھا ——— یہی وجہ ہے کہ وہ ہم تینوں میں سب سے زیادہ خاموش تھا لیکن عجیب بات ہے کہ ممتاز غیر معمولی طور پر باتونی ہو گیا تھا ——— خاص طور پر روانگی سے چند گھنٹے پہلے۔

صبح اٹھتے ہی اس نے پینا شروع کر دی۔ اسباب وغیرہ کچھ اس انداز سے باندھا اور بندھوایا جیسے وہ کہیں سیر و تفریح کے لیے جا رہا ہے ——— خود ہی بات کرتا تھا اور خود ہی ہنستا تھا کوئی اور دیکھتا تو سمجھتا کہ وہ بمبئی چھوڑنے میں ناقابلِ بیان مسرت محسوس کر رہا ہے۔ لیکن ہم تینوں اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ صرف اپنے جذبات چھپانے کے لیے ہمیں اور اپنے آپ کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

میں نے بہت چاہا کہ اس سے اس کی یک لخت روانگی کے متعلق بات کروں۔ اشارۃً میں نے جگل سے بھی کہا کہ وہ بات چھیڑے مگر ممتاز نے ہمیں کوئی موقعہ ہی نہ دیا۔

جگل تین چار پیگ پی کر اور بھی زیادہ خاموش ہو گیا اور دوسرے کمرے میں لیٹ گیا۔ میں اور برج موہن اس کے ساتھ رہے۔ اسے کئی بل ادا کرنے تھے، ڈاکٹروں کی فیسیں دینی تھیں، لانڈری سے کپڑے لانے تھے ——— یہ سب

کام اس نے ہنستے کھیلتے کئے، لیکن جب اس نے ناکے کے ہوٹل کے بازو والی دکان سے ایک پان لیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ برج موہن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر وہاں سے چلتے ہوئے اس نے ہولے سے کہا "یاد ہے برج — آج سے دس برس پہلے جب ہمارا حال بہت پتلا تھا، گوبند نے ہمیں ایک روپیہ ادھار دیا تھا!"

راستے میں ممتاز خاموش رہا، مگر گھر پہنچتے ہی اس نے پھر باتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ ایسی باتوں کا جن کا سر تھا نہ پیر۔ لیکن وہ کچھ ایسی پرخلوص تھیں کہ میں اور برج موہن برابر ان میں حصّہ لیتے رہے۔ جب روانگی کا وقت قریب آیا تو حسّگی بھی شامل ہو گیا۔ لیکن جب ٹیکسی بندرگاہ کی طرف چلی تو سب خاموش ہو گئے۔

ممتاز کی نظریں بمبئی کے وسیع اور کشادہ بازاروں کو الوداع کہتی رہیں حتیٰ کہ ٹیکسی اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گئی۔ بے حد بھیڑ تھی۔ ہزارہا ریفیوجی جا رہے تھے خوشحال بہت کم اور بدحال بہت زیادہ ——— بے پناہ ہجوم تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اکیلا ممتاز جا رہا ہے ہمیں چھوڑ کر ایسی جگہ جا رہا ہے جو اس کی دیکھی بھالی نہیں، جو اس کے مانوس بنانے پر بھی اجنبی رہے گی۔ لیکن یہ میرا اپنا خیال تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ممتاز کیا سوچ رہا تھا

جب کیبن میں سارا سامان چلا گیا تو ممتاز ہمیں عرشے پر لے گیا ——— ادھر جہاں آسمان اور سمندر آپس میں مل رہے تھے، ممتاز دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے

جگل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ یہ محض فریبِ نظر ہے ـــــ آسمان اور سمندر کا آپس میں ملنا ـــــ لیکن یہ فریبِ نظر کس قدر دل کش ہے ـــــ یہ ملاپ!"

جگل خاموش رہا۔ غالباً اس وقت بھی اس کے دل و دماغ میں اس کی یہ کہی ہوئی بات چٹکیاں لے رہی تھی: "میں سوچ رہا ہوں، بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں!"

ممتاز نے جہاز کی بار سے برانڈی منگوائی، کیونکہ وہ صبح سے یہی پی رہا تھا ـــــ ہم چاروں گلاس ہاتھ میں لیے جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے۔ ریفیوجی دھڑا دھڑ جہاز میں سوار ہو رہے تھے اور قریب قریب ساکن سمندر پر آبی پرندے منڈلا رہے تھے۔

جگل نے دفعتاً ایک ہی جرعے میں اپنا گلاس ختم کیا اور نہایت ہی بھونڈے انداز میں ممتاز سے کہا: "مجھے معاف کر دینا ممتاز ـــــ میرا خیال ہے میں نے اس روز تمہیں دکھ پہنچایا تھا!"

ممتاز نے تھوڑے توقف کے بعد جگل سے سوال کیا: "جب تم نے کہا تھا، میں سوچ رہا ہوں ـــــ بہت ممکن ہے میں تمہیں مار ڈالوں ـــــ کیا اس وقت واقعی تم نے یہی سوچا تھا ـــــ نیک دلی سے اسی نتیجے پر پہنچے تھے؟"

جگل نے اثبات میں سر ہلایا۔ ـــــ "لیکن مجھے افسوس ہے!"

"تم مجھے مار ڈالتے تو تمہیں زیادہ افسوس ہوتا۔" ممتاز نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا: "لیکن صرف اس صورت میں اگر تم نے غور کیا ہوتا کہ تم نے ممتاز کو ـــــ ایک مسلمان کو ـــــ ایک دوست کو نہیں بلکہ ایک انسان کو مارا ہے ـــــ وہ

اگر حرام زادہ تھا تو تم نے اس کی حرام زدگی کو نہیں، بلکہ خود اس کو مار ڈالا ہے ــــــ وہ اگر مسلمان تھا تو تم نے اس کی مسلمانی کو نہیں، اس کی ہستی کو ختم کیا ہے ــــــ اگر اس کی لاش مسلمانوں کے ہاتھ آتی تو قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہو جاتا، لیکن دنیا میں ایک انسان کم ہو جاتا!"

تھوڑی دیر خاموش رہنے اور کچھ سوچنے کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا "ہو سکتا ہے، میرے ہم مذہب مجھے شہید کہتے، لیکن خدا کی قسم اگر ممکن ہوتا تو میں قبر پھاڑ کر چلانا شروع کر دیتا، مجھے شہادت کا یہ رتبہ قبول نہیں ــــــ مجھے یہ ڈگری نہیں چاہیے جس کا امتحان میں نے دیا ہی نہیں ــــــ لاہور میں تمہارے چچا کو ایک مسلمان نے مار ڈالا ــــــ تم نے یہ خبر بمبئی میں سنی اور مجھے قتل کر دیا ــــــ بتاؤ، تم اور میں کس تمغے کے مستحق ہیں؟ ــــــ اور لاہور میں تمہارا چچا اور اس کا قاتل کس خلعت کا حقدار ہے ــــــ میں تو یہ کہوں گا، مرنے والے کتے کی موت مرے اور مارنے والوں نے بیکار ــــــ بالکل بیکار اپنے ہاتھ خون سے رنگے ــــــ"

باتیں کرتے کرتے ممتاز بہت زیادہ جذباتی ہو گیا لیکن اس زیادتی میں خلوص برابر کا تھا۔ میرے دل پر خصوصاً اس کی اس بات کا بہت اثر ہوا کہ مذہب، دین، ایمان، یقین، دھرم، عقیدت ــــــ جو کچھ بھی ہے ہمارے جسم کے بجائے روح میں ہوتا ہے جو چھرے، چاقو اور گولی سے فنا نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ میں نے اس سے

کہا "تم بالکل ٹھیک کہتے ہو"

یہ سن کر ممتاز نے اپنے خیالات کا جائزہ لیا اور قدرے بے چینی سے کہا "نہیں بالکل ٹھیک نہیں ——— میرا مطلب ہے کہ یہ سب ٹھیک تو ہے لیکن شاید میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، اچھی طرح ادا نہیں کر سکا ——— مذہب سے میری مُراد یہ مذہب نہیں، یہ دھرم نہیں جس میں ہم میں سے ننانوے فی صدی مبتلا ہیں ——— میری مراد اس خاص چیز سے ہے جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں کے مُقابلے میں جُداگانہ حیثیت بخشتی ہے ——— وہ چیز جو انسان کو حقیقت میں انسان ثابت کرتی ہے ——— لیکن یہ چیز کیا ہے؟ ——— افسوس ہے کہ میں اسے ہتھیلی پر رکھ کر نہیں دکھا سکتا" یہ کہتے کہتے ایک دم اس کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی اور اس نے جیسے خود سے پوچھنا شروع کر دیا "لیکن اس میں وہ کونسی خاص بات تھی؟ ——— کٹر ہندو تھا ——— پیشہ نہایت ہی ذلیل لیکن اس کے باوجود اس کی روح کس قدر روشن تھی؟"

میں نے پوچھا "کس کی؟"

"ایک بھڑوے کی"

ہم تینوں چونک پڑے۔ ممتاز کے لہجے میں کوئی تکلف نہیں تھا اس لیے میں نے سنجیدگی سے پوچھا "ایک بھڑوے کی؟"

ممتاز نے اثبات میں سر ہلا دیا "مجھے حیرت ہے کہ وہ کیسا انسان تھا اور زیادہ حیرت اس بات کی ہے کہ وہ عُرفِ عام میں ایک بھڑوا تھا ——— عورتوں کا دلّال ———

لیکن اس کا ضمیر بہت صاف تھا!"

ممتاز تھوڑی دیر کے لیے رُک گیا جیسے وہ پرانے واقعات اپنے دماغ میں تازہ کر رہا ہے ـــــ چند لمحات کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا: "اس کا پورا نام مجھے یاد نہیں ـــــ کچھ سہائے تھا ـــــ بنارس کا رہنے والا۔ بہت ہی صفائی پسند۔ وہ جگہ جہاں وہ رہتا تھا گو بہت ہی چھوٹی تھی مگر اس نے بڑے سلیقے سے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا ـــــ پردے کا معقول انتظام تھا۔ چارپائیاں اور پلنگ نہیں تھے، لیکن گدیلے اور گاؤ تکیے موجود تھے۔ چادریں اور غلاف وغیرہ ہمیشہ اُجلے رہتے تھے۔ نوکر موجود تھا مگر صفائی وہ خود اپنے ہاتھ سے کرتا تھا ـــــ صرف صفائی ہی نہیں، ہر کام ـــــ اور وہ سر سے بلا کبھی نہیں ٹالتا تھا، دھوکا اور فریب نہیں کرتا تھا ـــــ رات زیادہ گزر گئی ہے اور آس پاس سے پانی ملی شراب ملتی ہے تو وہ صاف کہہ دیتا تھا کہ صاحب اپنے پیسے ضائع نہ کیجیے ـــــ اگر کسی لڑکی کے متعلق اسے شک ہے تو وہ چھپاتا نہیں تھا ـــــ اور تو اور اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ تین برس کے عرصے میں بیس ہزار روپے کما چکا ہے ـــــ ہر دس میں سے ڈھائی کمیشن کے لے لے کر ـــــ اسے صرف دس ہزار اور بنانے تھے ـــــ معلوم نہیں صرف دس ہزار اور کیوں، زیادہ کیوں نہیں ـــــ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ تیس ہزار روپے پورے کر کے وہ واپس بنارس چلا جائے گا اور بزازی کی دکان کھولے گا ـــــ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ صرف بزازی ہی کی دکان کھولنے کا

آرزومند کیوں ہا؟"

میں یہاں تک سن چکا تو میرے منہ سے نکلا "عجیب وغریب آدمی تھا"
ممتاز نے اپنی گفتگو جاری رکھی"—— میرا خیال تھا کہ وہ سرتاپا بناوٹ ہے —— ایک بہت بڑا فراڈ ہے۔ کون یقین کرسکتا ہے کہ وہ ان تمام لڑکیوں کو جو اُس کے دھندے میں شریک تھیں۔ اپنی بیٹیاں سمجھتا تھا۔ یہ بھی اس وقت میرے لیے بعید از فہم تھا کہ اس نے ہر لڑکی کے نام پر پوسٹ آفس میں سیونگ اکاؤنٹس کھول رکھا تھا اور ہر مہینے کل آمدنی وہاں جمع کراتا تھا۔ اور یہ بات تو بالکل ناقابلِ یقین تھی کہ وہ دس بارہ لڑکیوں کے کھانے پینے کا خرچ اپنی جیب سے ادا کرتا ہے —— اس کی ہر بات مجھے ضرورت سے زیادہ بناوٹی معلوم ہوتی تھی —— ایک دن میں اس کے یہاں گیا تو اُس نے مجھ سے کہا امینہ اور سکینہ دونوں چھٹی پر ہیں —— میں ہر ہفتے ان دونوں کو چھٹی دے دیتا ہوں تاکہ باہر جاکر کسی ہوٹل میں ماس وغیرہ کھا سکیں —— یہاں تو آپ جانتے ہیں سب ویشنو ہیں —— میں یہ سُنکر دل ہی دل میں مسکرایا کہ مجھے بنا رہا ہے —— ایکدن اس نے مجھے بتایا کہ احمد آباد کی اس ہندو لڑکی نے جس کی شادی اس نے ایک مسلمان گاہک سے کرادی تھی لاہور سے خط لکھا ہے کہ داتا صاحبؒ کے دربار میں اس نے ایک منت مانی تھی جو پوری ہوئی۔ اب اس نے سہائے کے لیے منت مانی ہے کہ جلدی جلدی اس کے تیس ہزار روپے پورے ہوں اور وہ بنارس جا کر بزازی کی دکان کھول سکے۔ یہ سُنکر تو میں ہنس پڑا۔ میں نے سوچا چونکہ میں مسلمان

ہوں، اس لیے مجھے خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

میں نے ممتاز سے پوچھا "تمہارا خیال غلط تھا؟"

"بالکل ــــ اس کے قول و فعل میں کوئی بُعد نہیں تھا ــــ ہو سکتا ہے اس میں کوئی خامی ہو، بہت ممکن ہے اس سے اپنی زندگی میں کئی لغزشیں سرزد ہوئی ہوں ــــ مگر وہ ایک بہت ہی عمدہ انسان تھا۔"

جگل نے سوال کیا "یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"اس کی موت پر" یہ کہہ کر ممتاز کچھ عرصے کے لیے خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اُدھر دیکھنا شروع کیا جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں سمٹے ہوئے تھے: فسادات شروع ہو چکے تھے ــــ میں علی الصبح اٹھ کر بھنڈی بازار سے گزر رہا تھا ــــ کرفیو کے باعث بازار میں آمد و رفت بہت ہی کم تھی۔ ٹریم بھی نہیں چل رہی تھی ــــ ٹیکسی کی تلاش میں چلتے چلتے جب میں جے جے ہسپتال کے پاس پہنچا تو فٹ پاتھ پر ایک آدمی کو میں نے بڑے سے ٹوکرے کے پاس گٹھری سی بنے ہوئے دیکھا۔ میں نے سوچا کوئی پاٹی والا (مزدور) سو رہا ہے ــــ لیکن جب میں نے پتھر کے ٹکڑوں پر خون کے لوتھڑے دیکھے تو رُک گیا ــــ واردات قتل کی تھی، میں نے سوچا کہ اپنا راستہ لوں، مگر لاش میں حرکت پیدا ہوئی ــــ میں پھر رک گیا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ میں نے جھک کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے سہائے کا جانا پہچانا چہرہ نظر آیا مگر خون کے دھبوں

سے بھرا ہوا۔ میں اس کے پاس فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور غور سے دیکھا ــــــ اس کی توّل کی سفید قمیص جو ہمیشہ بے داغ ہوا کرتی تھی لہو سے لتھڑی ہوئی تھی ــــــ زخم شاید پسلیوں کے پاس تھا۔ اس نے ہولے ہولے کراہنا شروع کیا تو میں نے احتیاط سے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا جیسے کسی سوتے کو جگایا جاتا ہے۔ ایک دو بار میں نے اس کو نام مکمل نام سے بھی پکارا ــــــ میں اُٹھ کر جانے ہی والا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں ــــــ دیر تک وہ ان ادھ کھلی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتا رہا ــــــ پھر ایک دم اس کے سارے بدن میں تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور اس نے مجھے پہچان کر کہا "آپ ؟ ــــــ آپ ؟"

میں نے اس سے ملے اوپر بہت سی باتیں پوچھنا شروع کر دیں۔ وہ کیسے ادھر آیا، کس نے اس کو زخمی کیا، کب سے وہ فٹ پاتھ پر پڑا ہے، سامنے ہسپتال ہے، کیا میں وہاں اطلاع دوں؟

"اس میں بولنے کی طاقت نہیں تھی جب۔ میں نے سارے سوال کر ڈالے تو کراہتے ہوئے اس نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ کہے "میرے دن پورے ہو چکے ہیں ــــــ بھگوان کو یہی منظور تھا"

بھگوان کو جانے کیا منظور تھا، لیکن مجھے یہ منظور نہیں تھا کہ میں مسلمان ہو کر مسلمانوں کے علاقے میں ایک آدمی کو جس کے متعلق میں جانتا تھا کہ ہندو ہے، اس

احساس کے ساتھ مرتے دیکھوں کہ اس کو مارنے والا مسلمان تھا اور آخری وقت میں اس کی موت کے سرہانے جو آدمی کھڑا تھا، وہ بھی مسلمان تھا ——— میں ڈرپوک تو نہیں، لیکن اس وقت میری حالت ڈرپوکوں سے بدتر تھی۔ ایک طرف یہ خوف دامن گیر تھا، ممکن ہے میں ہی پکڑا جاؤں۔ دوسری طرف یہ ڈر تھا کہ پکڑا نہ گیا تو پوچھ گچھ کے لیے دھر لیا جاؤں گا ——— ایک بار یہ خیال آیا، اگر میں اسے ہسپتال لے گیا تو کیا پتہ ہے اپنا بدلہ لینے کی خاطر مجھے پھنسا دے۔ سوچے، مرنا تو ہے ہی۔ کیوں نہ اسے ساتھ لے کر مروں ——— اسی قسم کی باتیں سوچ کر میں چلنے ہی والا تھا ——— بلکہ یوں کہئے کہ بھاگنے والا تھا کہ گھائل نے مجھے پکارا۔ میں ٹھیر گیا ——— نہ ٹھیرنے کے ارادے کے باوجود میرے قدم رک گئے ——— میں نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا، گویا اس سے کہہ رہا ہوں، جلدی کرو میاں مجھے جانا ہے ——— اس نے درد کی تکلیف سے دوہرا ہوتے ہوئے، بڑی مشکلوں سے اپنی قمیص کے بٹن کھولے اور اندر ہاتھ ڈالا، مگر جب کچھ اور کرنے کی اس میں ہمت نہ رہی تو مجھ سے کہا ——— "نیچے بنڈی ہے ——— ادھر کی جیب میں کچھ زیور اور بارہ سو روپے ہیں یہ ——— یہ سلطانہ کا مال ہے .... میں نے .... میں نے ایک دوست کے پاس رکھا ہوا تھا .... آج اسے ...... آج اسے بھیجنے والا تھا ...... کیونکہ ...... کیونکہ آپ جانتے ہیں خطرہ بہت بڑھ گیا

گیا ہے...... آپ اسے دے دیجیے گا اور...... کہیے گا فوراً چلی جائے
...... لیکن...... اپنا خیال رکھئے گا!"

ممتاز خاموش ہو گیا، لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آواز، سہاگے کی آواز میں جو جے جے ہسپتال کے سامنے فٹ پاتھ پر ابھری تھی، دور، ادھر جہاں آسمان اور سمندر ایک دھندلی سی آغوش میں مدغم تھے، حل ہو رہی ہے۔

جہاز نے وسل دیا تو ممتاز نے کہا: "میں سلطانہ سے ملا —— اس کو زیور اور روپیہ دیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔"

جب ہم ممتاز سے رخصت ہو کر نیچے اترے تو وہ عرشے پر جنگلے کے ساتھ کھڑا تھا —— اس کا داہنا ہاتھ ہل رہا تھا —— میں جگل سے مخاطب ہوا "کیا تمہیں ایسا معلوم نہیں ہوتا کہ ممتاز، سہاگے کی روح کو بلا رہا ہے —— ہم سفر بنانے کے لیے؟"

جگل نے صرف اتنا کہا: "کاش، میں سہاگے کی روح ہوتا!"

"ٹُوٹُو"

میں سوچ رہا تھا:

دنیا کی سب سے پہلی عورت جب ماں بنی تو کائنات کا ردِ عمل کیا تھا؟

دنیا کے سب سے پہلے مرد نے کیا آسمانوں کی طرف تمتائی آنکھوں سے دیکھ کر دنیا کی سب سے پہلی زبان میں بڑے فخر کے ساتھ یہ نہیں کہا تھا "میں بھی خالق ہوں"؟

ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ میرے آوارہ خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بالکنی سے اٹھ کر میں اندر کمرے میں آیا۔ ٹیلی فون ضدّی بچے کی طرح چلّائے جا رہا تھا۔

ٹیلی فون بڑی مفید چیز ہے، مگر مجھے اس سے نفرت ہے۔ اس لیے کہ

یہ وقت بے وقت بجنے لگتا ہے ۔ چنانچہ بہت ہی بد دلی سے میں نے ریسیور اٹھایا اور نمبر بتایا "فور فور فائو سیون"۔

دوسرے سرے سے ہلو ہلو شروع ہوئی۔ میں جھنجھلا گیا۔ "کون ہے"

جواب ملا "آیا"

میں نے آیا اس کے طرزِ گفتگو میں پوچھا۔ "کس کو مانگتا ہے"

"میم صاحب ہے"

"ہے ۔۔۔۔ ٹھیرو"

ٹیلی فون کا ریسیور ایک طرف رکھ کر میں نے اپنی بیوی کو جو غالباً اندر سو رہی تھی، آواز دی "میم صاحب ۔۔۔۔ میم صاحب"

آواز سن کر میری بیوی اٹھی اور جمائیاں لیتی ہوئی آئی "یہ کیا مذاق ہے ۔۔۔۔۔ میم صاحب، میم صاحب!"

میں نے مسکرا کر کہا "میم صاحب ٹھیک ہے ۔۔۔۔ یاد ہے، تم نے اپنی پہلی آیا سے کہا تھا کہ مجھے میم صاحب کے بدلے بیگم صاحبہ کہا کرو تو اس نے بیگم صاحب کو بینگن صاحبہ بنا دیا تھا!"

ایک مسکراتی ہوئی جمائی لے کر میری بیوی نے پوچھا "کون ہے؟"

"دریافت کرلو"

میری بیوی نے ٹیلی فون اٹھایا اور ہلو ہلو شروع کردیا ۔۔۔۔ میں باہر

بالکنی میں چلا گیا ـــــــ عورتیں ٹیلی فون کے معاملے میں بہت لمبی ہوتی ہیں۔ چنانچہ پندرہ بیس منٹ تک ہلو ہلو ہوتا رہا۔

میں سوچ رہا تھا:

ٹیلی فون پر سہر دوتین الفاظ کے بعد ہلو کیوں کہا جاتا ہے؟

کیا اس ہلو ہلو کے عقب میں احساس کمتری تو نہیں؟ ـــــــ بار بار ہلو صرف اسے کرنی چاہیئے جسے اس بات کا اندیشہ ہو کہ اس کی مہمل گفت گو سے تنگ آکر سننے والا ٹیلی فون چھوڑ دیگا ـــــــ یا ہو سکتا ہے یہ محض عادت ہو۔

دفعتہً میری بیوی گھبرائی ہوئی آئی "سعادت صاحب، اس دفعہ معاملہ بہت ہی سیریس معلوم ہوتا ہے"

"کون سا معاملہ؟"

معاملے کی نوعیت بتائے بغیر میری بیوی نے کہنا شروع کر دیا "بات بڑھتے بڑھتے طلاق تک پہنچ گئی ہے ـــــــ پاگل پن کی بھی کوئی حد ہوتی ہے ـــــــ میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ بات کچھ بھی نہیں ہوگی۔ بس، پھسری کا بھگندر بنا ہوگا ـــــــ دونوں سر پھرے ہیں"

"اجی حضرت، کون؟"

"میں نے بتایا نہیں آپ کو؟ ـــــــ اوہ ـــــــ ٹیلی فون، طاہرہ کا تھا!"

"طاہرہ ـــــــ کون طاہرہ؟"

"مسز یزدانی!"

"اوہ!" میں سارا معاملہ سمجھ گیا: "کوئی نیا جھگڑا ہوا ہے؟"

نیا اور بہت بڑا ـــــ بھائیے یزدانی آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں"

"مجھ سے کیا بات کرنا چاہتا ہے؟"

"معلوم نہیں ـــــ طاہرہ سے ٹیلی فون چھین کر مجھ سے فقط یہ کہا "بھابی جان، ذرا منٹو صاحب کو بلا دیجیے!"

خواہ مخواہ میرا مغز چاٹے گا۔ یہ کہہ کر میں اٹھا اور ٹیلی فون پر یزدانی سے مخاطب ہوا۔

اس نے صرف اتنا کہا "معاملہ بے حد نازک ہو گیا ہے ـــــ تم اور بھابی جان ٹیکسی میں فوراً یہاں آجاؤ!"

میں اور میری بیوی جلدی جلدی کپڑے تبدیل کر کے یزدانی کی طرف روانہ ہو گئے ـــــ راستے میں ہم دونوں نے یزدانی اور طاہرہ کے متعلق بے شمار باتیں کیں۔

طاہرہ ایک مشہور عشق پیشہ موسیقار کی خوبصورت لڑکی تھی۔ عطا یزدانی ایک پٹھان آڑھتی کا لڑکا تھا۔ پہلے شاعری شروع کی، پھر ڈرامہ نگاری، اس کے بعد آہستہ آہستہ فلمی کہانیاں لکھنے لگا ـــــ طاہرہ کا باپ اپنے آٹھویں عشق میں مشغول تھا اور عطا یزدانی علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کے لیے "بیلچہ"

نامی ڈرامہ لکھنے میں۔ ایک شام پریڈ کرتے ہوئے عطا یزدانی کی آنکھیں طاہرہ کی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ ساری رات جاگ کر اس نے ایک خط لکھا اور طاہرہ تک پہنچا دیا ـــــ چند ماہ تک دونوں میں نامہ و پیام جاری رہا اور آخر کار دونو کی شادی بغیر کسی حیل حجت ہو گئی۔ عطا یزدانی کو اس بات کا افسوس تھا کہ ان کا عشق ڈرامے سے محروم رہا۔

طاہرہ بھی طبعاً ڈرامہ پسند تھی ـــــ عشق اور شادی سے پہلے سہیلیوں کے ساتھ باہر شوپنگ کو جاتی تو ان کے لیے مصیبت بن جاتی ـــــ گنجے آدمی کو دیکھتے ہی اس کے ہاتھوں میں کھجلی شروع ہو جاتی "میں اس کے سر پر ایک دھول تو ضرور جماؤں گی، چاہے تم کچھ ہی کرو۔"

ذہین تھی ـــــ ایک دفعہ اس کے پاس کوئی بیلٹ کوٹ نہیں تھا۔ اس نے کمر کے گرد ازار بند باندھا اور اس میں ساڑھی اڑس کر سہیلیوں کے ساتھ چل دی۔

کیا طاہرہ واقعی عطا یزدانی کے عشق میں مبتلا ہوئی تھی؟ اس کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یزدانی کا پہلا عشقیہ خط ملنے پر اس کا ردِ عمل غالباً یہ تھا کہ کھیل دلچسپ ہے کیا ہرج ہے کھیل لیا جائے۔ شادی پر بھی اس کا ردِ عمل کچھ اسی قسم کا تھا۔ یوں تو مضبوط کردار کی لڑکی تھی یعنی جہاں تک باعصمت ہونے کا تعلق ہے۔ لیکن تھی کھلنڈری۔ اور یہ جو آئے دن اس کا اپنے شوہر کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوتا تھا، میں سمجھتا ہوں ایک کھیل ہی تھا۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے اور حالات دیکھے تو معلوم ہوا کہ یہ کھیل

بڑی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔

ہمارے داخل ہوتے ہی وہ شور برپا ہوا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا طاہرہ اور یزدانی دونوں اونچے اونچے سروں میں بولنے لگے ۔ گلے شکوے، طعنے مہنے - پرانے مردوں پر نئی لاشیں، نئی لاشوں پر پرانے مردے ——— جب دونوں تھک گئے تو آہستہ آہستہ لڑائی کی نوک پلک نکلنے لگی۔

طاہرہ کو شکایت تھی کہ عطا اسٹوڈیو کی ایک واہیات ایکٹرس کو ٹیکسیوں میں لیے لیے پھرتا ہے۔

یزدانی کا بیان تھا کہ یہ سراسر بہتان ہے۔

طاہرہ قرآن اٹھانے کے لیے تیار تھی کہ عطا کا اس ایکٹرس سے ناجائز تعلق ہے جب وہ صاف انکاری ہوا تو طاہرہ نے بڑی تیزی کے ساتھ کہا "کتنے پارسا بنتے ہو ——— یہ آیا جو کھڑی ہے، کیا تم نے اسے چومنے کی کوشش نہیں کی تھی ...... وہ تو میں اوپر سے آ گئی ...."

یزدانی گرجا "بکواس بند کرو!"

اس کے بعد پھر وہی شور برپا ہو گیا۔

میں نے سمجھایا - میری بیوی نے سمجھایا مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ عطا کو تو میں نے ڈانٹا: "بھئی زیادتی سراسر تمہاری ہے ——— معافی مانگو اور یہ قصہ ختم کرو!"

عطا نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ میری طرف دیکھا: "سعادت، یہ قصہ یوں ختم

نہیں ہوگا ــــ میرے متعلق یہ عورت بہت کچھ کہہ چکی ہے، لیکن میں نے اسکے متعلق ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا ــــ "عنایت کو جانتے ہو تم؟"

"عنایت.؟"

"پہلے بیک سنگر ــــ اس کے باپ کا شاگرد!"

"ہاں ہاں"

"اوّل درجے کا چھٹا ہوا بدمعاش ہے ــــ گر یہ عورت ہر روز اسے یہاں بلاتی ہے ــــ بہانہ یہ ہے کہ......"

طاہرہ نے اس کی بات کاٹ دی" بہانہ وہانہ کچھ نہیں ــــ بولو، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

عطا نے انتہائی نفرت کے ساتھ کہا" کچھ نہیں"

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر بالوں کی جھالر ایک طرف ہٹائی "عنایت میرا چاہنے والا ہے ــــ بس!"

عطا نے گالی دی ــــ عنایت کو ماں اور طاہرہ کو چھوٹی ــــ پھر شور برپا ہوگیا۔

ایک بار پھر وہی کچھ دہرایا گیا جو پہلے کئی بار کہا جا چکا تھا ــــ میں نے اور میری بیوی نے بہت تالی کی مگر نتیجہ وہی صفر مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے عطا اور طاہرہ دونوں اپنے جھگڑے سے مطمئن نہیں۔ لڑائی کے شعلے ایک دم بھڑک کتے تھے

اور کوئی مرئی نتیجہ پیدا کیے بغیر ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ پھر بھڑکائے جاتے تھے لیکن ہوتا ہواتا کچھ نہیں تھا۔

میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ عطا اور طاہرہ چاہتے کیا ہیں مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا ـــــ مجھے بڑی اُلجھن ہو رہی تھی۔ دو گھنٹے سے بک بک اور جھک جھک جاری تھی لیکن انجام خدا معلوم کہاں بھٹک رہا تھا۔ تنگ آ کر میں نے کہا "بھئی، اگر تم دونوں کی آپس میں نہیں نبھ سکتی تو بہتر یہی ہے کہ علیحدہ ہو جاؤ۔"

طاہرہ خاموش رہی، لیکن عطا نے چند لمحات غور کرنے کے بعد کہا "علیحدگی نہیں ـــــ طلاق!"

طاہرہ چلّائی "طلاق، طلاق، طلاق ـــــ دیتے کیوں نہیں طلاق ـــــ میں کب تمہارے پاؤں پڑی ہوں کہ طلاق نہ دو"

عطا نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا: "دے دونگا اور بہت جلد۔"

طاہرہ نے اپنے ماتھے پر سے بالوں کی جھالر ایک طرف ہٹائی: "آج ہی دو۔"

عطا اٹھ کر ٹیلی فون کی طرف بڑھا: "میں قاضی سے بات کرتا ہوں۔"

جب میں نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ رہا ہے تو اٹھ کر عطا کو روکا: "بیوقوف نہ بنو ـــــ بیٹھو آرام سے!"

طاہرہ نے کہا "نہیں بھائی جان، آپ مت روکیے۔"

میری بیوی نے طاہرہ کو ڈانٹا: "بکواس بند کرو۔"

"یہ بکواس صرف طلاق ہی سے بند ہوگی" یہ کہہ کر طاہرہ ٹانگ ہلانے لگی۔
"سن لیا تم نے" عطا مجھ سے مخاطب ہو کر پھر ٹیلی فون کی طرف بڑھا لیکن میں درمیان میں کھڑا ہو گیا۔

طاہرہ میری بیوی سے مخاطب ہوئی "مجھے طلاق دے کر اس پڈے کو کون سی بیاہ رچائے گا"

عطا نے طاہرہ سے پوچھا "اور تو؟"

طاہرہ نے ماتھے پر بالوں کے پسینے میں بھیگی ہوئی جھالر ہاتھ سے اوپر کی "میں ——— تمہارے اس یوسف ثانی عنایت خان سے!"

"بس اب پانی سر سے گزر چکا ہے ——— حد ہو گئی ہے ——— تم ہٹ جاؤ ایک طرف" عطا نے ڈائرکٹری اٹھائی اور نمبر دیکھنے لگا جب وہ ٹیلی فون کرنے لگا تو میں نے اسے روکنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ایک دو مرتبہ ڈائل کیا، لیکن نمبر نہ ملا تو مجھے موقعہ ملا تو میں نے اسے پُرزور الفاظ میں کہا کہ اپنے ارادے سے باز رہے۔ میری بیوی نے بھی اس سے درخواست کی مگر وہ نہ مانا۔ اس پر طاہرہ نے کہا "صفیہ تم کچھ نہ کہو ——— اس آدمی کے پہلو میں دل نہیں، پتھر ہے ——— میں تمہیں وہ خط دکھاؤں گی جو شادی سے پہلے اس نے مجھے لکھے تھے ——— میں اس وقت اس کے دل کا قرار، اس کی آنکھوں کا نور تھی۔ میری زبان سے نکلا ہوا حرف ایک لفظ اس کے تن مردہ میں جان ڈالنے کے لیے کافی تھا۔"

میرے چہرے کی صرف ایک جھلک دیکھ کر یہ خودکشی مرنے کے لیے تیار تھا۔
لیکن آج اسے میری ذرہ برابر پروا نہیں"

عطا نے ایک بار پھر نمبر ملانے کی کوشش کی۔

طاہرہ بولتی رہی: "میرے باپ کی موسیقی سے بھی اسے عشق تھا ——— اس کو فخر تھا کہ اتنا بڑا آرٹسٹ مجھے اپنی دامادی میں قبول کر رہا ہے۔ شادی کی منظوری حاصل کرنے کے لیے اس نے انکے پاؤں تک دبائے، پر آج اسے انکا کوئی خیال نہیں"

عطا ڈائل گھماتا رہا۔

طاہرہ مجھ سے مخاطب ہوئی: "آپ کو یہ بھائی کہتا ہے، آپ کی عزت کرتا ہے ——— کہتا تھا جو کچھ بھائی جان کہیں گے میں مانوں گا ——— لیکن آپ دیکھ رہے ہیں ——— ٹیلی فون کر رہا ہے قاضی کو ——— مجھے طلاق دینے کے لیے"

میں نے ٹیلی فون ایک طرف ہٹا دیا: "عطا، اب چھوڑو بھی"

"نہیں" یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

طاہرہ بولی: "جانے دیجئے بھائی جان ——— اس کے دل میں میرا کیا، ڈُوڈُو کا بھی کوئی خیال نہیں!"

عطا تیزی سے پلٹا: "نام نہ لو ڈُوڈُو کا"

طاہرہ نے نتھنے پھلا کر کہا: "کیوں نام نہ لوں اس کا"

عطا نے ریسیور رکھ دیا: "وہ میرا ہے!"

طاہرہ اُٹھ کھڑی ہوئی: "جب میں تمہاری نہیں ہوا تو وہ کیسے تمہارا ہو سکتا ہے ـــــ تم تو اس کا نام بھی نہیں لے سکتے۔"

عطا نے کچھ دیر سوچا: "میں سب بندوبست کر لوں گا۔"

طاہرہ کے چہرے پر ایک دم زردی چھاگئی: "ٹُوڈُو کو چھین لو گے مجھ سے؟"

عطا نے بڑے مضبوط لہجے میں جواب دیا: "ہاں!"

"ظالم"

طاہرہ کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ بیہوش ہوکر گرنے ہی والی تھی کہ میری بیوی نے اسے تھام لیا ـــــ عطا پریشان ہوگیا۔ پانی کے چھینٹے۔ یوڈی کلون، سِملنگ سالٹ۔ ڈاکٹروں کو ٹیلیفون ـــــ اپنے بال نوچ ڈالے، قمیص پھاڑ ڈالی ـــــ طاہرہ ہوش میں آئی تو وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر سِسکنے لگا: "جانم ٹُوڈُو تمہارا ہے ـــــ ٹُوڈُو تمہارا ہے۔"

طاہرہ نے رونا شروع کر دیا: "نہیں وہ تمہارا ہے۔"

عطا نے طاہرہ کی آنسوؤں بھری آنکھوں کو چومنا شروع کر دیا: "میں تمہارا ہوں ـــــ تم میری ہو ـــــ ٹُوڈُو تمہارا بھی ہے، میرا بھی ہے!"

میں نے اپنی بیوی کو اشارہ کیا۔ وہ باہر نکلی تو میں بھی تھوڑی دیر کے بعد چل دیا ـــــ ٹیکسی کھڑی تھی، ہم دونو بیٹھ گئے۔ میری بیوی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا: "یہ ٹُوڈُو کون ہے؟"

میری بیوی کھکھلا کر ہنس پڑی: "ان کا لڑکا"
میں نے حیرت سے پوچھا: "لڑکا؟"
میری بیوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
میں نے اور زیادہ حیرت سے پوچھا: "کب پیدا ہوا تھا ــــ میرا مطلب ہے..."
"ابھی پیدا نہیں ہوا ـــــ چوتھے مہینے میں ہے"
چوتھے مہینے، یعنی اس واقعے کے چار مہینے بعد، میں باہر بالکنی میں بالکل خالی الذہن بیٹھا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی۔ بڑی بے دلی سے اٹھنے والا تھا کہ آواز بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میری بیوی آئی۔ میں نے اس سے پوچھا: "کون تھا؟"
"یزدانی صاحب"
"کوئی نئی لڑائی تھی؟"
"نہیں ـــــ طاہرہ کے لڑکی ہوئی ہے ـــــ مری ہوئی" یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی اندر چلی گئی۔
میں سوچنے لگا: "اگر اب طاہرہ اور عطا کا جھگڑا ہوا تو اسے کون ڈھونڈ کر چکائے گا؟"

رام کھلاون

کھٹمل مارنے کے بعد میں ٹرنک میں پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا کہ سعید بھائی جان کی تصویر مل گئی۔ میز پر ایک خالی فریم پڑا تھا ــــ میں نے اس تصویر سے اس کو پُر کر دیا اور کرسی پہ بیٹھ کر دھوبی کا انتظار کرنے لگا۔

ہر اتوار کو مجھے اسی طرح انتظار کرنا پڑتا تھا کیونکہ ہفتے کی شام کو میرے دُھلے ہوئے کپڑوں کا سٹاک ختم ہو جاتا تھا ــ مجھے سٹاک تو نہیں کہنا چاہیے اس لیے کہ مفلسی کے اس زمانے میں میرے پاس صرف اتنے کپڑے تھے جو بمشکل چھ سات دن تک میری وضع داری قائم رکھ سکتے تھے۔

میری شادی کی بات چیت ہو رہی تھی اور اس سلسلے میں پچھلے دو تین اتواروں سے میں باہر جا رہا تھا۔ دھوبی شریف آدمی تھا یعنی دھلائی نہ ملنے کے باوجود ہر اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ پورے دس بجے میرے کپڑے لے آتا تھا، لیکن پھر بھی مجھے کھٹکا تھا کہ ایسا نہ ہو، میری نادہندگی سے تنگ آکر کسی روز میرے کپڑے چور بازار میں فروخت کر دے اور مجھے اپنی شادی کی بات چیت میں بغیر کپڑوں کے حصّہ

لینا پڑے جو کہ ظاہر ہے بہت ہی معیوب بات ہوتی۔

کھولی میں مرے ہوئے کھٹملوں کی نہایت ہی مکروہ بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے کس طرح دباؤں کہ دھوبی آگیا۔ "ساب سلام" کرکے اس نے اپنی گٹھڑی کھولی اور میرے گنتی کے کپڑے میز پر رکھ دیے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی نظر سعید بھائی جان کی تصویر پر پڑی۔ ایک دم چونک کر اس نے اس کو غور سے دیکھنا شروع کر دیا اور ایک عجیب و غریب آواز حلق سے نکالی: "ہے ہے ہے ہیں؟"

میں نے اس سے پوچھا: "کیا بات ہے دھوبی؟"

دھوبی کی نظریں تصویر پر جمی رہیں: "یہ تو ساعید شالیم بالشٹر ہے؟"

"کون؟"

دھوبی نے میری طرف دیکھا اور بڑے وثوق سے کہا: "ساعید شالیم بالشٹر!"

"تم جانتے ہو انہیں؟"

دھوبی نے زور سے سر ہلایا: "ہاں..... دو بھائی ہوتا ـــــ ادھر کولابا میں ان کا کوٹھی ہوتا ـــــ ساعید شالیم بالشٹر ـــــ ہم ان کا کپڑا دھوتا ہوتا۔"

میں نے سوچا یہ دو برس پہلے کی بات ہوگی کیونکہ سعید حسن اور محمد حسن بھائی جان نے فجی آئی لینڈ جانے سے پہلے تقریباً ایک برس بمبئے میں پریکٹس کی تھی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا: "دو برس پہلے کی بات کرتے ہو تم؟"

دھوبی نے زور سے سر ہلایا: "ہاں ـــ ساعید شالیم بالشٹر جب گیا تو ہم کو

ایک پگڑی دیا ــــ ایک دھوتی دیا ــــ ایک کرتہ دیا ــــ نیا ــــ بہت اچھا لوگ ہوتا ــــ ایک کا داڑھی ہوتا ــــ یہ بڑا، اس نے ہاتھ سے داڑھی کی لمبائی بتائی اور سعید بھائی جان کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہ چھوٹا ہوتا ــــ اس کا نین بادا لوگ ہوتا ــــ دو لڑکا ایک لڑکی ــــ ہمارے سنگ بہت کھیلتا ہوتا ــــ کولابے میں کوٹھی ہوتا ــــ بہت بڑا......"

میں نے کہا: "دھوبی یہ میرے بھائی ہیں"

دھوبی نے حلق سے عجیب و غریب آواز نکالی: "ہے ہے ہے ہیں؟ ــــ ساعید شالیم بالشٹر؟؟"

میں نے اس کی حیرت دور کرنے کی کوشش کی اور کہا: "یہ تصویر سعید بھائی جان کی ہے ــــ داڑھی والے مُحسنہ حسن ہیں ــــ سب سے بڑے"

دھوبی نے میری طرف گھور کے دیکھا، پھر میری کھولی کی غلاظت کا جائزہ لیا ــــ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی، بجلی کی لائٹ سے محروم، ایک میز تھا، ایک کرسی اور ایک ٹاٹ کی کوٹ جس میں ہزار ہا کٹمل تھے۔ دھوبی کو یقین نہیں آتا تھا کہ میں ساعید شالیم بالشٹر کا بھائی ہوں، لیکن جب میں نے اسکو انکی بہت سی باتیں بتائیں تو اس نے سر کو عجیب طریقے سے جنبش دی اور کہا: "ساعید شالیم بالشٹر کولابے میں رہتا اور تم اس کھولی میں!"

میں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں کہا: "دنیا کے یہی رنگ ہیں دھوبی ــــ کہیں

دھوپ کہیں چھاؤں —— پانچ انگلیاں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔"

"ہاں ساب —— تم برو بر کہتا ہے" یہ کہہ کر دھوبی نے گٹھڑی اٹھائی اور باہر جانے لگا۔ مجھے اس کے حساب کا خیال آیا۔ جیب میں صرف آٹھ آنے تھے جو شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم تک جانے آنے کے لیے بمشکل کافی تھے۔ صرف یہ بتانے کے لیے کہ میری نیت صاف ہے میں نے اسے ٹھیرایا۔ اور کہا: "دھوبی کپڑوں کا حساب یاد رکھنا —— خدا معلوم کتنی دھلائیاں ہو چکی ہیں۔"

دھوبی نے اپنی دھوتی کا لانگ درست کیا اور کہا: "ساب، ہم حساب نہیں رکھتا —— ساعید شالیم بالسٹر کا ایک برس کام کیا —— جو دیدیا، لے لیا —— ہم حساب جانتا ہی ناہیں۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور میں شادی کی بات چیت کے سلسلے میں ماہم جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔

بات چیت کامیاب رہی —— میری شادی ہو گئی۔ حالات بھی بہتر ہو گئے اور میں سیکنڈ پیر خان اسٹریٹ کی کھولی سے جس کا کرایہ نو روپے ماہوار تھا کلیئر روڈ کے ایک فلیٹ میں جس کا کرایہ پینتیس روپے ماہوار تھا، اٹھ آیا اور دھوبی کو ماہ بماہ باقاعدگی سے اس کی دھلائیوں کے دام ملنے لگے۔

دھوبی خوش تھا کہ میرے حالات پہلے کی بہ نسبت بہتر ہیں چنانچہ اس نے میری بیوی سے کہا: "بیگم ساب —— ساب کا بھائی ساعید شالیم بالسٹر بہت

بڑا آدمی ہوتا ـــــ ادھر کولابہ میں رہتا ہوتا...... جب گیا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتہ دیا ہوتا ـــــ تمہارا ساب بھی ایک دن بڑا آدمی بنتا ہوتا ؟"

میں اپنی بیوی کو تصویر والا قصہ سنا چکا تھا اور اس کو یہ بھی بتا چکا تھا کہ مفلسی کے زمانے میں کتنی دریا دلی سے دھوبی نے میرا ساتھ دیا ـــــ جب دیدیا، جو دیدیا، اس نے کبھی شکایت کی ہی نہ تھی ـــــ لیکن میری بیوی کو تھوڑے عرصے کے بعد ہی اس سے یہ شکایت پیدا ہو گئی کہ وہ حساب نہیں کرتا۔ میں نے اس سے کہا "چار برس میرا کام کرتا رہا ہے ـــــ اس نے کبھی حساب نہیں کیا۔"

جواب یہ ملا "حساب کیوں کرتا ـــــ ویسے دوگنے چوگنے وصول کر لیتا ہوگا۔"

"وہ کیسے ؟"

"آپ نہیں جانتے ـــــ جن کے گھروں میں بیویاں نہیں ہوتیں ان کو ایسے لوگ بیوقوف بنانا جانتے ہیں۔"

قریب قریب ہر مہینے دھوبی سے میری بیوی کی چخ چخ ہوتی تھی کہ وہ کپڑوں کا حساب الگ اپنے پاس کیوں نہیں رکھتا۔ وہ بڑی سادگی سے صرف اتنا کہہ دیتا "بیگم ساب ـــــ ہم حساب جانتا نہیں۔ تم جھوٹ نہیں بولے گا ـــــ ساعید شاہد بالسٹر جو تمہارے ساب کا بھائی ہوتا ـــــ ہم ایک برس اس کا کام کیا ہوتا ـــــ بیگم ساب بولتا دھوبی تمہارا اتنا پیسہ ہوا ـــــ ہم بولتا، ٹھیک ہے۔"

ایک مہینے ڈھائی سو کپڑے دھلائی میں گئے۔ میری بیوی نے آزمانے

کے لیے اس سے کہا: "دھوبی اس مہینے ساٹھ کپڑے ہوئے"!

اس نے کہا "ٹھیک ہے ——— بیگم ساب، تم جھوٹ ناہیں بولیگا"!

میری بیوی نے ساٹھ کپڑوں کے حساب سے جب اس کو دام دیئے تو اس نے ماتھے سے ساتھ روپے چھوا کر سلام کیا اور چلنے لگا۔ میری بیوی نے اسے روکا۔

"ٹھیرو دھوبی ——— ساٹھ نہیں، ڈھائی سو کپڑے تھے ——— لو اپنے باقی روپئے میں نے مذاق کیا تھا"!

دھوبی نے صرف اتنا کہا: "بیگم ساب تم جھوٹ ناہیں بولے گا"! باقی کے روپے اپنے ماتھے کے ساتھ چھوا کر سلام کیا اور چلا گیا۔

شادی کے دو برس بعد میں دلّی چلا گیا۔ ڈیڑھ برس وہاں رہا، پھر واپس بمبئی آ گیا اور ماہم میں رہنے لگا۔ تین مہینے کے دوران میں ہم نے چار دھوبی تبدیل کیے کیونکہ بے حد بے ایمان اور جھگڑالو تھے۔ ہر دھلائی پر جھگڑا اٹھ کھڑا ہو جاتا تھا۔ کبھی کپڑے کم نکلتے تھے، کبھی دھلائی نہایت ذلیل ہوتی تھی۔ ہمیں اپنا پرانا دھوبی یاد آنے لگا۔ ایک روز جب کہ ہم بالکل بغیر دھوبی کے رہ گئے تھے، وہ اچانک آ گیا اور کہنے لگا "ساب کو ہم نے ایک دن بس میں دیکھا ——— ہم بولا، ایسا کیسا ——— ساب تو دلّی چلا گیا تھا ...... ہم نے ادھر بائیکلہ میں تپاس کیا، چھاپہ والا بولا، ادھر ماہم میں تپاس کرو ——— باجو والی چالی میں ساب کا دوست ہوتا ——— اس سے پوچھا اور آ گیا"!

ہم بہت خوش ہوئے اور ہمارے کپڑوں کے دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔

کانگرس پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو امتناعِ شراب کا حکم نافذ ہو گیا۔ انگریزی شراب ملتی تھی لیکن دیسی شراب کی کشید اور فروخت بالکل بند ہو گئی۔ نناوے فی صدی دھوبی شراب کے عادی تھے ـــــ دن بھر پانی میں رہنے کے بعد شام کو پاؤ آدھ پاؤ شراب ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی ـــــ ہمارا دھوبی بیمار ہو گیا۔ اس بیماری کا علاج اس نے اس زہریلی شراب سے کیا جو ناجائز طور پر کشید کر کے چھپے چوری بکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے معدے میں خطرناک گڑبڑ پیدا ہو گئی جس نے اس کو موت کے دروازے تک پہنچا دیا۔

میں بے حد مصروف تھا۔ صبح چھ بجے گھر سے نکلتا تھا اور رات کو دس ساڑھے دس بجے لوٹتا تھا۔ میری بیوی کو جب اس کی خطرناک بیماری کا علم ہوا تو وہ ٹیکسی لے کر اس کے گھر گئی۔ نوکر اور شوفر کی مدد سے اس کو گاڑی میں بٹھایا اور ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر بہت متاثر ہوا چنانچہ اس نے فیس لینے سے انکار کر دیا۔ لیکن میری بیوی نے کہا: "ڈاکٹر صاحب، آپ سارا ثواب حاصل نہیں کر سکتے!"

ڈاکٹر مسکرایا: "تو آدھا آدھا کر لیجیے!"

ڈاکٹر نے آدھی فیس قبول کر لی۔

دھوبی کا باقاعدہ علاج ہوا۔ معدے کی تکلیف چند انجکشنوں ہی سے دور ہو گئی۔ نقاہت تھی، وہ آہستہ آہستہ مقوّی دواؤں کے استعمال سے ختم ہو گئی۔ چند مہینوں کے بعد وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور اٹھتے بیٹھتے ہمیں دعائیں دیتا تھا۔ "بھگوان ساب کر سیعتا بالنشٹر بنائے ـــــ ادھر گوالیے میں ساب رہنے کو جائے ـــــ

بادالوگ ہوں ــــ بہت بہت پیسہ ہو ــــ بیگم ساب دھوبی کو لینے آیا ــــ موٹر میں ــــ اودھر کلے (کلفٹن) میں بہت بڑے ڈاکٹر کے پاس سے گیا جس کے پاس میم ہوتا ــــ بھگوان بیگم ساب کو خوش رکھے ۔ ۔ ۔"

کئی برس گذر گئے اس دوران میں کئی سیاسی انقلاب آئے۔ دھوبی بلا ناغہ اتوار کو آتا رہا۔ اس کی صحت اب بہت اچھی تھی۔ اتنا عرصہ گذرنے پر بھی وہ ہمارا سلوک نہیں بھولا تھا۔ ہمیشہ دعائیں دیتا تھا۔ شراب قطعی طور پر چھوٹ چکی تھی۔ شروع میں وہ کبھی کبھی اسے یاد کیا کرتا تھا پر اب نام تک نہ لیتا تھا۔ ہمارا اودن پانی میں رہنے کے بعد تھکن دور کرنے کے لیے اب اسے دارو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

حالات بہت زیادہ بگڑ گئے۔ بٹوارہ ہوا تو ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے۔ ہندوؤں کے علاقوں میں مسلمان اور مسلمانوں کے علاقوں میں ہندو دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں ہلاک کئے جانے لگے۔ میری بیوی لاہور چلی گئی۔

جب حالات اور زیادہ خراب ہوئے تو میں نے دھوبی سے کہا: "دیکھو دھوبی اب تم کام بند کرو ــــ یہ مسلمانوں کا محلہ ہے، ایسا نہ ہو کوئی تمہیں مار ڈالے۔"

دھوبی مسکرایا۔ "ساب اپن کو کوئی نہیں مارتا۔"

ہمارے محلے میں کئی واردات ہوئیں مگر دھوبی برابر آتا رہا۔

ایک اتوار میں گھر میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ کھیلوں کے صفحے پر کرکٹ کے میچوں کا اسکور درج تھا اور پہلے صفحے پر فسادات کے شکار ہندوؤں اور مسلمانوں

کے اعداد و شمار ـــــ میں ان دونوں کی خوفناک مماثلت پر غور کر رہا تھا کہ دھوبی آ گیا۔ کاپی نکال کر میں نے کپڑوں کی پڑتال شروع کی تو دھوبی نے ہنس ہنس کر باتیں شروع کر دیں۔ "سائید شالیم بالشٹر بہت اچھا آدمی ہوتا ـــــ یہاں سے جاتا تو ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا ـــــ تمہارا بیگم ساب بھی ایک دم اچھا آدمی ہوتا ـــــ باہر کام گیا ہے نا؟ ـــــ اپنے ملک میں؟ ادھر کاگج لکھو تو ہمارا اسلام بولو........ موٹر سے گر آیا ہماری کھولی میں ـــــ ہم کو اتنا جلاب آتا ہوتا ـــــ ڈاکڈر نے سوئی لگایا ـــــ ایک دم ٹھیک ہو گیا ـــــ ادھر کاگج لکھو تو ہمارا اسلام بولو ـــــ بولو رام کھلاون بولتا ہے ہم کو بھی کاگج لکھو ـــــ"

میں نے اس کی بات کاٹ کر تیزی سے کہا: "دھوبی ـــــ دارو شروع کر دی ہے؟"

دھوبی ہنسا: "دارو؟ ـــــ دارو کہاں ملتی ہے ساب؟"

میں نے اور کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے میلے کپڑوں کی گٹھڑی بنائی اور سلام کر کے چلا گیا۔

چند دنوں میں حالات بہت ہی زیادہ خراب ہو گئے۔ لاہور سے تار پر تار آنے لگے کہ سب کچھ چھوڑ کر جلدی چلے آؤ۔ میں نے ہفتے کے روز ارادہ کر لیا کہ اتوار کو چل دوں گا۔ لیکن مجھے صبح سویرے نکل جانا تھا۔ کپڑے دھوبی کے پاس تھے

میں نے سوچا کرفیو سے پہلے پہلے اس کے ہاں جا کرہے آؤں۔ چنانچہ شام کو وکٹوریہ لے کر مہالکشمی روانہ ہو گیا۔

کرفیو کے وقت میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا اس لیے آمد و رفت جاری تھی۔ ٹرامیں چل رہی تھیں۔ میری وکٹوریہ پُل کے پاس پہونچی تو ایک دم شور برپا ہوا لوگ اندھا دھند بھاگنے لگے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سانڈوں کی لڑائی ہو رہی ہے ——— ہجوم چھدرا ہوا تو دیکھا، دور بھینسوں کے پاس بہت سے دھوبی لاٹھیاں ہاتھ میں لیے ناچ رہے ہیں اور طرح طرح کی آوازیں نکال رہے ہیں۔ مجھے ادھر ہی جانا تھا مگر وکٹوریہ والے نے انکار کر دیا۔ میں نے اس کو کرایہ ادا کیا اور پیدل چل دیا ——— جب دھوبیوں کے پاس پہنچا تو وہ مجھے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

میں نے آگے بڑھ کر ایک دھوبی سے پوچھا "رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟"

ایک دھوبی جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی جھومتا ہوا اس دھوبی کے پاس آیا جس سے میں نے سوال کیا تھا "کیا پوچھت ہے؟"

"پوچھت ہے رام کھلاون کہاں رہتا ہے؟"

شراب سے دھت دھوبی نے قریب قریب میرے اوپر چڑھ کر پوچھا "تم کون ہے؟"

"میں؟ ——— رام کھلاون میرا دھوبی ہے"

"رام کھلاون تمہارا دھوبی ہے ——— تو کس دھوبی کا بچہ ہے؟"

ایک چلایا "ہندو دھوبی کا یا مسلمان دھوبی کا؟"

تمام دھوبی جو شراب کے نشے میں جھوم رہے تھے تاشا دیکھنے کے لئے اٹھیاں گھماتے میرے ارد گرد جمع ہو گئے۔ مجھے ان کے صرف ایک سوال کا جواب دینا تھا مسلمان ہوں یا ہندو ـــــ میں بے حد خوفزدہ ہو گیا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ میں ان میں گھرا ہوا تھا۔ نزدیک کوئی پولیس والا بھی نہیں تھا جس کو مدد کیلئے پکارتا ـــــ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو بے جوڑ الفاظ میں ان سے گفتگو شروع کر دی۔ "رام کھلاون ہندو ہے..... ہم پوچھتا ہے وہ کدھر رہتا ہے.... اس کی کھولی کہاں ہے؟..... دس برس سے وہ ہمارا دھوبی ہے..... بہت بیمار تھا..... ہم نے اس کا علاج کرایا تھا ـــــ ہماری بیگم..... ہماری میم صاحب یہاں موٹر لیکر آئی تھی......... یہاں تک میں نے کہا تو مجھے اپنے اوپر بہت ترس آیا۔ دل ہی دل میں بہت خفیف ہوا کہ انسان اپنی جان بچانے کیلئے کتنی نچلی سطح پر اتر آتا ہے۔ اس احساس نے جرأت پیدا کر دی چنانچہ میں نے ان سے کہا "میں مسلمان ہوں۔"

"مار ڈالو ـــــ مار ڈالو" کا شور بلند ہوا۔

دھوبی جو کہ شراب کے نشے میں دھت تھا ایک طرف دیکھ کر چلایا "ٹھہرو ـــــ اسے رام کھلاون مارے گا!"

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ رام کھلاون موٹا ڈنڈا ہاتھ میں لیے لڑکھڑا رہا تھا۔

اس نے میری طرف دیکھا اور مسلمانوں کو اپنی زبان میں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ڈنڈا سر تک اٹھا کر گالیاں دیتا ہوا وہ میری طرف بڑھا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا "رام کھلاون"

رام کھلاون دہاڑا: "چپ کر بے رام کھلاون کے......"

میری آخری امید بھی ڈوب گئی۔ جب وہ میرے قریب آپہنچا تو میں نے خشک گلے سے ہولے سے کہا: "مجھے پہچانتے نہیں رام کھلاون؟"

رام کھلاون نے وار کرنے کے لیے ڈنڈا اٹھایا ۔۔۔ ایک دم اس کی آنکھیں سکڑیں، پھر پھیلیں۔ ڈنڈا ہاتھ سے گرا کر اس نے قریب آکر مجھے غور سے دیکھا اور پکارا: "ساب!" پھر وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا: "یہ مسلمین نہیں" ۔۔۔ یہ میرا ساب ہے ۔۔۔ بیگم ساب کا ساب ۔۔۔ وہ موٹر لیکر آیا تھا...... ڈاکڈر کے پاس لے گیا تھا ۔۔۔ جس نے میرا جلاب ٹھیک کیا تھا"

رام کھلاون نے اپنے ساتھیوں کو بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے ۔۔۔ سب شرابی تھے۔ تو تو میں میں شروع ہو گئی۔ کچھ دھوبی رام کھلاون کی طرف ہو گئے اور ہاتھا پائی پر نوبت آ گئی۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور وہاں سے کھسک گیا۔

دوسرے روز صبح نو بجے کے قریب میرا سامان تیار تھا۔ صرف جہاز کے

ٹکٹوں کا انتظار تھا جو ایک دوست بلیک مارکیٹ سے حاصل کرنے گیا تھا۔

میں بہت بیقرار تھا۔ دل میں طرح طرح کے جذبات ابل رہے تھے جی چاہتا تھا کہ جلدی ٹکٹ آجائیں اور میں بندرگاہ کی طرف چل دوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر دیر ہوگئی تو میرا فلیٹ مجھے اپنے اندر قید کرلے گا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے سوچا ٹکٹ آگئے۔ دروازہ کھولا تو باہر دھوبی کھڑا تھا۔

"ساب سلام!"

"سلام!"

"میں اندر آجاؤں؟"

"آؤ!"

وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا۔ گٹھڑی کھول کر اس نے کپڑے نکال پلنگ پر رکھے۔ دھوتی سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور گلوگیر آواز میں کہا "آپ جا رہے ہیں ساب؟"

"ہاں"

اس نے رونا شروع کر دیا۔ "ساب مجھے ماف کر دو ــــــ یہ سب دارو کا قصور تھا.... اور دارو.... دارو آج کل مفت ملتی ہے ــــ سیٹھ لوگ بانٹتا ہے کہ پی کر مسلمین کو مارو..... مفت کی دارو کون چھوڑتا ہے ساب....

ھسم کو ماف کردو ـــــ ہم پیئے لا تھا ـــــ سا عید شالیم بالشٹر ہمارا بہت مہربان ہوتا ـــــ ہم کو ایک پگڑی، ایک دھوتی، ایک کرتا دیا ہوتا .... تمہارا بیگم ساب ہمارا جان بچایا ہوتا ـــــ جلاب سے ہم مرتا ہوتا ـــــ وہ موٹر لے کر آتا، ڈاکڈر کے پاس لے جاتا، اتنا پیسہ خرچ کرتا ـــــ تم ملک جاتا ـــــ بیگم ساب سے مت بولنا، رام کھلاون ...."

اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔ گٹھڑی کی چادر کاندھے پر ڈال کر چلنے لگا تو میں نے روکا: "ٹھیرو رام کھلاون!"

لیکن وہ دھوتی کا لانگ سنبھالتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

بسم اللہ

فلم بنانے کے سلسلے میں ظہیر سے سعید کی ملاقات ہوئی۔ سعید بہت متاثر ہوا۔ بمبئی میں اس نے ظہیر کو سنٹرل اسٹوڈیوز میں ایک دو مرتبہ دیکھا تھا۔ اور شاید چند باتیں بھی کی تھیں مگر مفصل ملاقات پہلی مرتبہ لاہور ہی میں ہوئی۔

لاہور میں یوں تو بیشمار فلم کمپنیاں تھیں مگر سعید کو اس تلخ حقیقت کا علم تھا کہ ان میں سے اکثر کا وجود صرف ان کے نام کے بورڈوں تک ہی محدود ہے۔ ظہیر نے جب اس کو اکرم کی معرفت بلایا تو اس کو سو فیصدی یقین تھا کہ ظہیر بھی دوسرے فلم پروڈیوسروں کی طرح کھوکھلا ہے جو لاکھوں کی باتیں کرتے ہیں آفس قائم کرتے ہیں، کرائے پر فرنیچر لاتے ہیں اور آخر میں آس پاس کے ہوٹلوں کے بل مار کر بھاگ جاتے ہیں۔

ظہیر نے بڑی سادگی سے سعید کو بتایا کہ وہ کم سے کم سرمائے سے فلم بنانا چاہتا ہے۔ بمبئی میں وہ اسسٹنٹ فلم بنانے والے ڈائرکٹر کا اسسٹنٹ تھا۔ پانچ برس تک وہ اس کے ماتحت کام کرتا رہا۔ اس کو خود فلم بنانے کا موقعہ ملنے ہی والا تھا کہ ہندوستان تقسیم ہوگیا اور اسے پاکستان آنا پڑا۔ یہاں وہ تقریباً ڈھائی سال بیکار رہا مگر اس دوران میں اس نے چند آدمی ایسے تیار کیے جو روپیہ لگانے کے لیے تیار ہیں۔ اس نے سعید سے کہا "دیکھئے سحاب میں کوئی فرسٹ کلاس فلم بنانا نہیں چاہتا۔ کم علم آدمی ہوں۔ اسسٹنٹ فلم بنا سکتا ہوں اور ان شاء اللہ اچھا اسسٹنٹ فلم بناؤں گا۔ پچاس ہزار روپوں کے اندر اندر سو فیصدی نفع تو یقینی ہے — آپ کا کیا خیال ہے ؟"

سعید نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا "ہاں اتنا نفع تو ہونا چاہیئے۔"

ظہیر نے کہا "جو آدمی روپیہ لگانے کے لیے تیار ہیں میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ حساب کتاب سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہوگا۔ یہ کام آپ کا ہے — باقی سب چیزیں میں سنبھال لوں گا۔"

سعید نے پوچھا "مجھ سے آپ کیا خدمت چاہتے ہیں؟"

ظہیر نے بڑی سادگی سے کہا "پاکستان کے تقریباً تمام ڈسٹری بیوٹر آپ کو جانتے ہیں۔ میری یہاں ان لوگوں سے واقفیت نہیں۔ بڑی نوازش ہوگی اگر آپ میرے فلم کی ڈسٹری بیوشن کا بندوبست کر دیں۔"

بسم اللہ

سعید نے کہا "آپ فلم تیار کریں، انشاء اللہ ہو جائے گا"

"آپ کی بڑی مہربانی ہے" یہ کہہ کر ظہیر نے میز پر پڑے ہوئے پیڈ پر پنسل سے ایک پھول سا بنایا "سعید صاحب، مجھے سو فیصد ہی یقین ہے کہ میں کامیاب رہوں گا —— ہیروئین میری بیوی ہوگی"

سعید نے پوچھا "آپ کی بیوی؟"

"جی ہاں!"

"پہلے کسی فلم میں کام کر چکی ہیں؟"

"جی نہیں" ظہیر نے پیڈ پر پھول کے ساتھ شاخ بناتے ہوئے کہا "میں نے شادی یہاں لاہور میں آ کر کی ہے —— میرا ارادہ تو نہیں تھا کہ اسے فلم لائن میں لاؤں مگر اس کو شوق ہے —— بہت شوق ہے۔ ہر روز ایک فلم دیکھتی ہے —— میں آپ کو اس کا فوٹو دکھاتا ہوں"

ظہیر نے میز کا دراز کھول کر ایک لفافہ نکالا اور اس میں سے اپنی بیوی کا فوٹو سرکا کر سعید کی طرف بڑھا دیا۔

سعید نے فوٹو دیکھا۔ معمولی خد و خال کی جوان عورت تھی۔ تنگ ماتھا، ایک ناک، موٹے موٹے ہونٹ، آنکھیں بڑی بڑی اور اداس۔

یہ آنکھیں ہی تھیں جو اس کے چہرے کے دوسرے خطوط کے مقابلے میں سب سے نمایاں تھیں۔ سعید نے غور سے ان کو دیکھنا چاہا مگر معیوب سمجھا اور فوٹو

میز پر رکھ دیا۔

ظہیر نے پوچھا "کیا خیال ہے آپ کا؟"

سعید کے پاس اس سوال کا جواب تیار نہیں تھا۔ اس کے دل و دماغ پر دراصل وہ آنکھیں چھائی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی اداس آنکھیں۔ غیرارادی طور پر اس نے میز پر سے فوٹو اٹھایا اور ایک نظر دیکھ کر پھر وہیں رکھ دیا اور کہا "آپ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔"

ظہیر نے پیڈ پر ایک اور پھول بنانا شروع کیا "یہ فوٹو اچھی نہیں —— فوراً سی لی ہوئی ہے۔"

اتنے میں پچھلے دروازے کا پردہ ہلا اور ظہیر کی بیوی داخل ہوئی —— وہی بڑی بڑی اداس آنکھیں۔ ظہیر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا "عجیب و غریب نام ہے اس کا —— بسم اللہ" پھر سعید کی طرف اشارہ کیا "یہ میرے دوست سعید صاحب ہیں۔"

بسم اللہ نے کہا "آداب عرض۔"

سعید نے اس کا جواب اٹھ کر دیا "تشریف رکھئے۔"

بسم اللہ دوپٹہ ٹھیک کرتی سعید کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گئی ہلکے بیازی رنگ کے کلف لگے ململ کے مہین دوپٹے کے پیچھے اس کے سینے کا ابھار جھلملیاں کھا رہا تھا۔ سعید نے اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیں۔

ظہیر نے فوٹو واپس لفافے میں رکھا اور سعید سے کہا "مجھے سو فیصدی یقین ہے کہ بسم اللہ پہلے ہی فلم میں کامیاب ثابت ہوگی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا اس کا فلمی نام کیا رکھوں۔ بسم اللہ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

سعید نے بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی اداس آنکھوں میں وہ ایک لحظے کے لیے جیسے ڈوب سا گیا۔ فوراً ہی نگاہ اس طرف سے ہٹا کر اس نے ظہیر سے کہا "جی ہاں ——— بسم اللہ ٹھیک نہیں ہے، کوئی اور نام ہونا چاہیئے۔"

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بسم اللہ خاموش تھی۔ اس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں بھی خاموش تھیں۔ سعید نے اس دوران میں ان آنکھوں کے اندر کئی بار ڈبکیاں لگائیں۔ ظہیر اور وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ بسم اللہ خاموش بیٹھی اپنی بڑی بڑی اداس آنکھوں پر چھائی ہوئی سیاہ پلکیں جھپکاتی رہی۔ اس کے ہلکے پیازی رنگ کے کلف لگے ململ کے مہین دوپٹے کے پیچھے اس کے سینے کا ابھار برابر چغلیاں کھاتا رہا۔ سعید ادھر دیکھتا تو ایک دھکے کے ساتھ اس کی نظریں دوسری طرف پلٹ جاتیں۔

بسم اللہ کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ فوٹو میں اس کی رنگت کا پتا نہیں چلتا تھا۔ اس گہرے سانولے رنگ پر اس کی بڑی بڑی کالی آنکھیں اور بھی زیادہ اداس ہو گئی تھیں۔ سعید نے کئی مرتبہ سوچا کہ اس اداسی کا باعث کیا ہے؟ ——— ان کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اداس دکھائی دیتی ہیں یا کوئی وجہ ہے۔ کوئی معقول بات سعید کے

ذہن میں نہ آئی۔

ظہیر بمبئی کی باتیں شروع کرنے والا تھا کہ بسم اللہ اٹھی اور چلی گئی۔ اس کی چال میں بے ڈھنگا پن تھا، جیسے اس نے اونچی ایڑی کے چپل نئے نئے استعمال کرنے شروع کیے ہیں۔ غرارے کی نشست بھی ٹھیک نہیں تھی۔ مسلوٹوں کا گراؤ بیدا تھا۔ اس کے علاوہ سعید نے یہ بھی محسوس کیا کہ ادب و آداب سے بسم اللہ محض کوری ہے ——— لیکن اس کے گہرے سانولے چہرے پر دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ اُداس ہونے کے باوجود کس قدر جذبات انگیز تھیں!

چند ہی ملاقاتوں میں ظہیر سے سعید کے تعلقات بہت گہرے ہو گئے۔ ظہیر بے حد سادہ دل تھا۔ اس خاص چیز سے سعید بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کی کسی بھی بات میں بناوٹ نہیں ہوتی تھی۔ خیال جس شکل میں پیدا ہوتا تھا سادہ الفاظ میں تبدیل ہو کر اس کی زبان پر آجاتا تھا۔ کھانے پینے اور رہنے سہنے کے معاملے میں بھی وہ سادگی پسند تھا۔

جب بھی سعید اس کے یہاں جاتا، ظہیر اس کی خاطر تواضع کرتا۔ سعید نے اس سے کئی بار کہا کہ تم یہ تکلیف نہ کیا کرو مگر وہ نہ مانا۔ وہ اکثر کہا کرتا، "اس میں کیا تکلیف ہے آپ کا اپنا گھر ہے۔"

سعید نے جب تقریباً ہر روز ظہیر کے ہاں جانا شروع کیا تو اس نے سوچا کہ یہ بہت بڑی بات ہے، وہ میری اتنی عزت کرتا ہے۔ مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے اور

میں اس سے صرف اس لیے ملتا ہوں کہ مجھے اس کی بیوی سے دل چسپی پیدا ہو گئی ہے، یہ بہت بڑی بات ہے۔

اس کے ضمیر نے کئی دفعہ اسے ٹوکا مگر وہ برابر ظہیر کے ہاں جاتا رہا۔

بسم اللہ اکثر آجاتی تھی، شروع شروع میں وہ خاموش بیٹھی رہتی پھر آہستہ آہستہ اس نے باتوں میں حصّہ لینا شروع کر دیا۔ لیکن گفت گو کے لحاظ سے وہ خام تھی۔ سعید کو دکھ ہوتا تھا کہ وہ اچھی باتیں کرنا کیوں نہیں جانتی؟

کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ظہیر گھر سے باہر تھا۔ سعید نے آواز دی تو بسم اللہ بولی "باہر گئے ہوئے ہیں" یہ سن کر سعید کچھ دیر کھڑا رہا کہ شاید وہ اس سے کہے "اندر آ جائیے، ابھی آتے ہیں۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

ظہیر کے فلم کا چکر چل رہا تھا۔ اس کا ذکر قریب قریب ہر روز ہوتا۔ ظہیر کہتا مجھے اتنی جلدی نہیں ہے، ہر ایک چیز آرام سے ہوگی اور اپنے وقت پر ہوگی۔

سعید کو ظہیر کے فلم سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ اس کو اگر دل چسپی تھی تو بسم اللہ سے بس کی بڑی بڑی اداس آنکھوں میں وہ کئی بار غوطے لگا چکا تھا۔ اور اس کی یہ دل چسپی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی جس کا احساس اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات تھی کہ وہ اپنے دوست ظہیر کی بیوی سے جسمانی رشتہ پیدا کرنے کا خواہاں تھا۔

دن گزرتے گئے ظہیر کے فلم کا کام وہیں کا وہیں تھا۔ سعید ایک دن اس سے

ملنے گیا تو وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا، چلنے ہی والا تھا کہ بسم اللہ نے کہا" اندر آ جائیے، وہ کہیں دور نہیں گئے۔"

سعید کا دل دھڑکنے لگا۔ کچھ توقف کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ بسم اللہ میز کے پاس کھڑی تھی۔ سعید نے جرأت سے کام لے کر اس سے کہا" بیٹھئے۔"

بسم اللہ اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر خاموش رہی، اس کے بعد سعید نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر کہا" ظہیر آئے نہیں ابھی تک؟"

بسم اللہ نے مختصر جواب دیا" آ جائیں گے۔"

تھوڑی دیر پھر خاموش رہی۔ اس دوران میں کئی مرتبہ سعید نے بسم اللہ کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اٹھ کر ان کو چومنا شروع کر دے، اس قدر چومے کہ ان کی ساری اداسی دھل جائے۔ مگر سعید نے اس خواہش پر قابو پا کر اس سے کہا" آپ کو فلم میں کام کرنے کا بہت شوق ہے؟"

بسم اللہ نے ایک جمائی لی اور جواب دیا" ہے تو سہی۔"

سعید ناصح بن گیا" یہ لائن اچھی نہیں، میرا مطلب ہے بڑی بدنام ہے۔" اس کے بعد اس نے فلم لائن کی تمام برائیاں بیان کرنا شروع کر دیں۔ ظہیر کا خیال آیا تو اس نے رخ بدل لیا" آپ کو شوق ہے تو خیر دوسری بات ہے کیرکٹر مضبوط ہو تو آدمی کسی بھی لائن میں ثابت قدم رہ سکتا ہے۔ پھر ظہیر خود اپنا فلم بنا رہا ہے لیکن

بسم اللہ

آپ کسی دوسرے کے غلم میں کام ہرگز نہ کیجئے گا؟"

بسم اللہ خاموش رہی۔ سعید کو اس کی یہ خاموشی بہت بڑی معلوم ہوئی۔ پہلی مرتبہ اس کو تنہائی میں اس سے ملنے کا موقعہ ملا تھا مگر وہ بولتی ہی نہیں تھی۔ سعید نے ایک دو مرتبہ ڈرتے ڈرتے ٹوہ لینے والی نگاہوں سے اسے دیکھا مگر کوئی ردِ عمل پیدا نہ ہوا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا "اچھا تو پان ہی کھلایئے"

بسم اللہ اٹھی۔ ریشمی دوپٹے کے پیچھے اس کے سینے کا نمایاں ابھار، سعید کی نگاہوں کو دھکا سا لگا۔ بسم اللہ دوسرے کمرے میں گئی تو وہ ڈر ڈر کے تیکھی تیکھی باتیں سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پان لے کر آئی اور سعید کے پاس کھڑی ہو گئی۔

سعید نے شکریہ کہہ کر پان لیا تو اس کی انگلیاں بسم اللہ کی انگلیوں سے چھوئیں اس کے سارے بدن میں برقی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ضمیر کا نشتر اس کے دل میں چبھا۔

بسم اللہ سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے گہرے سانولے چہرے سے سعید کو کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ سعید نے سوچا "کوئی اور عورت ہوتی تو فوراً سمجھ جاتی کہ میں اسے کن آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ لیکن شاید سمجھ گئی ہو۔ شاید نہ بھی سمجھی ہو کچھ سمجھ ہی نہیں آتا"

سعید کا دماغ بے حد مضطرب تھا ایک طرف بسم اللہ کا ستانے والا وجود تھا، اس کی بڑی بڑی اداس آنکھیں، اس کے سینے کا نمایاں ابھار۔ دوسری طرف ظہیر کا خیال، اس کے ضمیر کا کانٹا۔ سعید عجیب الجھن میں پھنس گیا تھا بسم اللہ کی طرف سے کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ جو چیز سعید سوچ رہا ہے ناممکن ہے مگر وہ پھر بھی اس کو انہی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوا: "ظہیر نہیں آئے، میرا خیال ہے میں چلتا ہوں"

بسم اللہ نے خلافِ توقع کہا: "نہیں نہیں بیٹھیے"

"آپ تو کوئی بات ہی نہیں کرتیں" یہ کہہ کر سعید اٹھا۔

بسم اللہ نے پوچھا: "چلے؟"

سعید نے اس کی طرف ٹوہ لینے والی نگاہوں سے دیکھا: "جی نہیں، بیٹھتا ہوں آپ کو اگر کوئی اعتراض نہ ہو"

بسم اللہ نے ایک جمائی لی: "مجھے کیا اعتراض ہوگا"

بسم اللہ کی آنکھوں میں خمار سا پیدا ہوگیا۔ سعید نے کہا: "آپ کو شاید نیند آرہی ہے"

"جی ہاں رات جاگتی رہی"

سعید نے ذرا بے تکلفی سے پوچھا: "کیوں؟"

بسم اللہ

بسم اللہ نے ایک اور جمائی لی: "کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔"
سعید بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بسم اللہ سو گئی۔ اس کے سینے کا نمایاں ابھار ریشمی قمیص کے پیچھے سانس کے زیر و بم سے ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ بڑی بڑی اداس آنکھیں اب بند تھیں۔ دایاں بازو ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ آستین اوپر کو اٹھ گئی تھی۔ سعید نے دیکھا، گہرے سانولے رنگ کی کلائی پر مہندی کے حروف کھدے ہوئے تھے۔ اتنے میں ظہیر آ گیا۔
سعید اس کی آمد پر سٹپٹا سا گیا۔ ظہیر نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اپنی بیوی بسم اللہ کی طرف دیکھا: "ارے سو رہی ہے۔"
سعید نے کہا: "میں جا رہا تھا۔ کہنے لگیں ظہیر صاحب ابھی آ جائیں گے، آپ بیٹھئے۔ میں بیٹھا تو آپ سو گئیں۔"
ظہیر ہنسا۔ سعید بھی ہنسنے لگا۔
"بھئی واہ، اٹھو اٹھو" ظہیر نے بسم اللہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔
بسم اللہ نے ایک لمبی آہ بھری اور اپنی بڑی بڑی اداس آنکھیں کھول دیں۔ اداسی کے ساتھ ساتھ اب ان میں ویرانی سی بھی تھی۔
"چلو چلو، اٹھو۔ ایک ضروری کام پر جانا ہے۔" بسم اللہ سے یہ کہہ کر ظہیر سعید سے مخاطب ہوا: "معاف کیجئے گا سعید صاحب۔ میں ایک کام سے جا رہا ہوں انشاء اللہ کل ملاقات ہو گی۔"

سعید چلا گیا۔ دوسرے روز اس نے ظہیر کے ہاں جانے سے پہلے یہ دعا مانگی کہ وہ گھر پر نہ ہو۔ وہاں پہنچا تو باہر کئی آدمی جمع تھے۔ سعید کو ان سے معلوم ہوا کہ — بسم اللہ ظہیر کی بیوی نہیں تھی۔ وہ ایک ہندو لڑکی تھی جو فسادوں میں یہاں رہ گئی تھی۔ ظہیر اس سے پیشہ کراتا تھا۔ پولیس ابھی ابھی اسے برآمد کر کے لے گئی ہے۔

دو بڑی بڑی سیاہ اور اداس آنکھیں اب سعید کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔

ننگی آوازیں

بھولو اور گاما دو بھائی تھے۔ بے حد محنتی۔ بھولو قلعی گر تھا۔ صبح دھونکنی سر پر رکھ کر نکلتا اور دن بھر شہر کی گلیوں میں "بھانڈے قلعی کرا لو" کی صدائیں لگاتا رہتا۔ شام کو گھر لوٹتا تو اس کے تہ بند کے ڈب میں تین چار روپے کا کریانہ ضرور ہوتا۔

گاما خوانچہ فروش تھا۔ اس کو بھی دن بھر چھابڑی سر پر اٹھائے گھومنا پڑتا تھا۔ تین چار روپے یہ بھی کما لیتا تھا، مگر اس کو شراب کی لت تھی۔ شام کو دینے کے بھٹیار خانے سے کھانا کھانے سے پہلے ایک پاؤ شراب اسے ضرور چاہیئے تھی۔ پینے کے بعد وہ خوب چہکتا۔ دینے کے بھٹیار خانے میں رونق لگ جاتی۔ سب کو معلوم تھا کہ وہ پیتا ہے اور اسی کے سہارے جیتا ہے۔

بھولو نے گاما کو جو کہ اس سے دو سال بڑا تھا بہت سمجھایا کہ دیکھو یہ شراب

کی لت بہت بُری ہے۔ شادی شدہ ہو، بیکار پیسہ برباد کرتے ہو۔ بیچ جو تم ہر روز ایک پاؤ شراب پر خرچ کرتے ہو بچا کر گھر تو بھابی ٹھاٹ سے رہا کرے۔ نئی نئی اچھی لگتی ہے تمہیں اپنی گھروالی۔ گاما نے اس کان سنا، اس کان سے نکال دیا۔ بھولو جب تھک ہار گیا تو اس نے کہنا سننا ہی چھوڑ دیا۔

دونوں مہاجر تھے ایک بڑی بلڈنگ کے ساتھ سرونٹ کوارٹر تھے، ان پر جہاں اوروں نے قبضہ جما رکھا تھا وہاں ان دونوں بھائیوں نے بھی ایک کوارٹر جو کہ دوسری منزل پر تھا، اپنی رہائش کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

سردیاں آرام سے گزر گئیں گرمیاں آئیں تو گاما کو بہت تکلیف ہوئی۔ بھولو تو اوپر کوٹھے پر کھاٹ بچھا کر سو جاتا تھا۔ گاما کیا کرتا، بیوی تھی اور اوپر پردے کا کوئی بندوبست ہی نہیں تھا۔ ایک گاما کو ہی یہ تکلیف نہیں تھی۔ کوارٹروں میں جو بھی شادی شدہ تھا اسی مصیبت میں گرفتار تھا۔

کلن کو ایک بات سوجھی اس نے کوٹھے پر کونے میں اپنی اور اپنی بیوی کی چارپائی کے اردگرد ٹاٹ تان دیا۔ اس طرح پردے کا انتظام ہو گیا۔ کلن کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی اس ترکیب سے کام لیا۔ بھولو نے بھائی کی مدد کی اور چند ہی دنوں میں بالس وغیرہ گاڑ کر ٹاٹ اور کمبل جوڑ کر پردے کا انتظام کر دیا۔ لیکن ہوا تو رک جاتی تھی مگر نیچے کوارٹر کے دوزخ سے، حالت میں یہ جگہ بہتر تھی۔

اوپر کوٹھے پر سونے سے بھولو کی طبیعت میں ایک عجیب انقلاب پیدا

ہوگیا۔ وہ شادی بیاہ کا بالکل قائل نہیں تھا۔ اس نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ یہ جنجال کبھی نہیں پالے گا۔ جب گاما کبھی اس کے بیاہ کی بات چھیڑتا تو وہ کہا کرتا تھا: "نا بھائی میں اپنے نرد ئیے پنڈے پر جونکیں نہیں لگوانا چاہتا۔" لیکن جب گرمیاں آئیں اور اس نے اوپر کھاٹ بچھا کر سونا شروع کیا تو دس پندرہ دن میں اس کے خیالات بدل گئے۔ ایک شام کو دینے کے بھٹیار خانے میں اس نے اپنے بھائی سے کہا: "میری شادی کر دو، نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گا!"

گاما نے جب یہ سنا تو اس نے کہا: "یہ کیا مذاق سوجھا ہے تمہیں؟"

بھولو بہت سنجیدہ ہوگیا: "تمہیں نہیں معلوم — ۔۔۔ — پندرہ راتیں ہو گئی ہیں مجھے جاگتے ہوئے۔"

گاما نے پوچھا: "کیوں کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں یار ——— دائیں بائیں جدھر نظر ڈالو کچھ نہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے —— عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں۔ نیند کیا آئے گی خاک!"

گاما زور سے اپنی گھنی مونچھوں میں ہنسا۔ بھولو شرما گیا: "وہ جو کلّن ہے، اس نے تو حد ہی کر دی ہے ——— سالا رات بھر بکواس کرتا رہتا ہے۔ اس کی بیوی سالی کی زبان بھی تالو سے نہیں لگتی —— نیچے پڑے رو رہے ہیں، مگر وہ ۔۔۔۔۔۔"

گاما حسب معمول نشے میں تھا۔ بھولو گیا تو اس نے دینے کے بھٹیار خانے میں اپنے سب واقف کاروں کو خوب چہک چہک کر بتایا کہ اس کے بھائی کو آج کل

نیند نہیں آتی۔ اس کا باعث جب اس نے اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا تو سننے والوں کے پیٹ میں ہنس ہنس کے بل پڑ گئے جب یہ لوگ بھولے سے ملے تو اس کا خوب مذاق اڑایا۔ کوئی اس سے پوچھتا: ہاں بھئی کلن اپنی بیوی سے کیا باتیں کرتا ہے؟ کوئی کہتا: میاں مفت میں مزے لیتے ہو ——— ساری رات فلمیں دیکھتے رہتے ہو ——— سو فیصدی گاتی بولتی؟

بعضوں نے گندے سے گندے مذاق کیے۔ بھولو چڑ گیا۔ گاما صوفی حالت میں تھا تو اس نے اس سے کہا: تم نے تو یار میرا مذاق بنا دیا ہے ——— دیکھو جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے جھوٹ نہیں۔ میں انسان ہوں۔ خدا کی قسم مجھے نیند نہیں آتی۔ آج بیس دن ہو گئے ہیں جاگتے ہوئے ——— تم میری شادی کا بندوبست کر دو ورنہ قسم پنج تن پاک کی میرا خانہ خراب ہو جائے گا۔ بھابی کے پاس میرا پانچ سو روپیہ جمع ہے ——— جلدی کر دو بندوبست!"

گاما نے مونچھ مروڑ کر پہلے کچھ سوچا پھر کہا: اچھا ہو جائے گا بندوبست تمہاری بھابی سے آج ہی بات کرتا ہوں کہ وہ اپنی ملنے والیوں سے پوچھ گچھ کرے۔"

ڈیڑھ مہینے کے اندر اندر بات پکی ہو گئی۔ صمد قلعی گر کی لڑکی عائشہ گاما کی بیوی کو بہت پسند آئی۔ خوبصورت تھی۔ گھر کا کام کاج جانتی تھی۔ ویسے صمد بھی شریف تھا۔ محلے والے اس کی عزت کرتے تھے۔ بھولو محنتی تھا، تندرست تھا جوان

کے وسط میں شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی۔ صمد نے بہت کہا کہ وہ لڑکی کو اتنی گرمیوں میں نہیں بیاہے گا مگر بھولو نے جب زور دیا تو وہ مان گیا۔

شادی سے چار دن پہلے بھولو نے اپنی دلہن کے لیے اوپر کوٹھے پر ٹاٹ کے پردے کا بندوبست کیا۔ بانس بڑی مضبوطی سے فرش میں گاڑے۔ ٹاٹ خوب کس کر لگایا۔ چارپائیوں پر نئے کھیس بچھائے۔ نئی صراحی منڈیر پر رکھی۔ شیشے کا گلاس بازار سے خریدا۔ سب کام اس نے بڑے اہتمام سے کیے۔

رات کو جب وہ ٹاٹ کے پردے میں گھر کر سویا تو اس کو عجیب سا لگا۔ وہ کھلی ہوا میں سونے کا عادی تھا۔ مگر اب اس کو عادت ڈالنی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شادی سے چار دن پہلے ہی اس نے یوں سونا شروع کر دیا۔ پہلی رات جب وہ لیٹا اور اس نے اپنی بیوی کے بارے میں سوچا تو وہ پسینے میں تر بتر ہوگیا۔ اس کے کانوں میں وہ آوازیں گونجنے لگیں جو اسے سونے نہیں دیتی تھیں اور اس کے دماغ میں طرح طرح کے پریشان خیالات دوڑاتی تھیں۔

کیا وہ بھی ایسی ہی آوازیں پیدا کرے گا؟ —— کیا آس پاس کے لوگ یہ آوازیں سنیں گے۔ کیا وہ بھی اسی کے مانند راتیں جاگ جاگ کر کاٹیں گے۔ کسی نے اگر جھانک کر دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

بھولو پہلے سے بھی زیادہ پریشان ہوگیا۔ ہر وقت اس کو یہی بات ستاتی رہی کہ ٹاٹ کا پردہ بھی کوئی پردہ ہے۔ پھر چاروں طرف لوگ بکھرے پڑے ہیں۔ رات

کی خاموشی میں ہلکی سی سرگوشی بھی دوسرے کانوں تک پہنچ جاتی ہے ـــــ لوگ کیسے یہ ننگی زندگی بسر کرتے ہیں ـــــ ایک کوٹھے ہے اس چارپائی پر بیوی لیٹی ہے، اس چارپائی پر خاوند پڑا ہے۔ سینکڑوں آنکھیں، سینکڑوں کان آس پاس کھلے ہیں۔ نظر نہ آنے پر بھی آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ ہلکی سی آہٹ پوری تصویر بن کر سامنے آ جاتی ہے ـــــ یہ ٹاٹ کا پردہ کیا ہے۔ سورج نکلتا ہے تو اس کی روشنی ساری چیزیں بے نقاب کر دیتی ہے۔ وہ سامنے کلّن اپنی بیوی کی چھاتیاں دبا رہا ہے۔ وہ کونے میں اس کا بھائی گاما لیٹا ہے۔ تہہ بند کھل کر ایک طرف پڑا ہے۔ ادھر عید و حلوائی کی کنواری بیٹی شاداں کا پیٹ چھدرے ٹاٹ سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا ہے شادی کا دن آیا تو بھولو کا جی چاہا کہ وہ کہیں بھاگ جائے مگر کہاں جاتا۔ اب تو وہ جکڑا جا چکا تھا۔ غائب ہو جاتا تو صمد ضرور خودکشی کر لیتا۔ اس کی لڑکی پر جانے کیا گزرتی۔ جو طوفان مچتا وہ الگ۔

"اچھا جو ہوتا ہے ہونے دو ـــــ میرے ساتھی اور بھی تو ہیں۔ آہستہ آہستہ عادت ہو جاتے گی مجھے بھی" ـــــ بھولو نے خود کو ڈھارس دی اور اپنی نئی نویلی دولہن کی ڈولی گھر لے آیا۔

کوارٹروں میں چہل پہل پیدا ہو گئی۔ لوگوں نے بھولو اور گاما کو خوب مبارک بادیں دیں۔ بھولو کے جو خاص دوست تھے، انہوں نے اس کو چھیڑا اور پہلی رات کے لیے کئی کارآمد گر بتائے۔ بھولو خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کی بھابی نے اوپر کوٹھے

ننگی آوازیں

پر ٹاٹ کے پردوں کے نیچے بستر کا بندوبست کر دیا۔ گاما نے چار موتیے کے بڑے بڑے ہار تکیئے کے پاس رکھ دیے۔ ایک دوست اس کے لیے جلیبیوں والا دودھ لے آیا۔

دیر تک وہ نیچے کوارٹر میں اپنی دلہن کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ بےچاری شرم کی ماری سر نیوڑھائے، گھونگٹ کاڑھے سمٹی ہوئی تھی۔ سخت گرمی تھی۔ بھولو کا نیا کرتہ اس کے جسم کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ پنکھا جھل رہا تھا مگر ہوا جیسے بالکل ہی غائب ہو گئی تھی۔ بھولو نے پہلے سوچا تھا کہ وہ اوپر کوٹھے پر نہیں جائے گا، نیچے کوارٹر ہی میں رات کاٹے گا۔ مگر جب گرمی انتہا کو پہنچ گئی تو وہ اٹھا اور دلہن سے چلنے کو کہا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ تمام کوارٹر خاموشی میں لپٹے ہوئے تھے۔ بھولو کو اس بات کی تسکین تھی کہ سب سو رہے ہوں گے۔ کوئی اس کو نہیں دیکھے گا۔ چپ چاپ دبے قدموں سے وہ اپنے ٹاٹ کے پیچھے اپنی دلہن سمیت داخل ہو جائے گا اور صبح منہ اندھیرے نیچے اتر جائے گا۔

جب وہ کوٹھے پر پہونچا تو بالکل خاموشی تھی۔ دلہن نے شرماتے ہوئے قدم اٹھائے تو پازیب کے نقرئی گھنگھرو بجنے لگے۔ ایک دم بھولو نے محسوس کیا کہ چاروں طرف جو نیند بکھری ہوئی تھی چونک کر جاگ پڑی ہے۔ چارپائیوں پر لوگ کروٹیں بدلنے لگے۔ کھانسنے کھنکارنے کی آوازیں ادھر ادھر ابھریں۔ دبی دبی سرگوشیاں اس تپتی ہوئی فضا میں تیرنے لگیں۔ بھولو نے گھبرا کر اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے ٹاٹ کی

اوٹ میں چلا گیا۔ دبی دبی ہنسی کی آواز اس کے کانوں کے ساتھ ٹکرائی۔ اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ بیوی سے بات کی تو پاس ہی کھسر پھسر شروع ہو گئی۔ دور کونے میں جہاں گلّن کی جگہ تھی وہاں چارپائی کی چرچوں چرچوں ہونے لگی۔ یہ دھیمی پڑی تو گاما کی لوہے کی چارپائی بولنے لگی۔ —— عید دھلوائی کی کنواری لڑکی شاداں نے دو تین بار اٹھ کر پانی پیا۔ گھڑے کے ساتھ اس کا گلاس ٹکراتا تو ایک چھناکا سا پیدا ہوتا۔ خیرے قصائی کے لڑکے کی چارپائی سے بار بار ماچس جلانے کی آواز آتی تھی۔

بھولو اپنی دولہن سے کوئی بات نہ کر سکا۔ اسے ڈر تھا کہ آس پاس کے کھلے ہوئے کان فوراً اس کی بات نگل جائیں گے اور ساری چارپائیاں چرچوں چرچوں کرنے لگیں گی۔ دم سادھے وہ خاموش لیٹا رہا۔ کبھی کبھی سہمی ہوئی نگاہ سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ لیتا جو گٹھڑی سی بنی دوسری چارپائی پر لیٹی تھی۔ کچھ دیر جاگتی رہی، پھر سو گئی۔

بھولو نے چاہا کہ وہ بھی سو جائے مگر اس کو نیند نہ آئی۔ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اس کے کانوں میں آوازیں آتی تھیں —— آوازیں جو فوراً تصویر بن کر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی تھیں۔

اس کے دل میں بڑے ولولے تھے۔ بڑا جوش تھا۔ جب اس نے شادی کا ارادہ کیا تھا تو وہ تمام لذتیں جن سے وہ ناآشنا تھا اس کے دل و دماغ میں چکر لگاتی رہتی تھیں۔ اس کو گرمی محسوس ہوتی تھی، بڑی راحت بخش گرمی، مگر اب جیسے پہلی رات سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس نے رات میں کئی بار یہ دلچسپی پیدا کرنے

کی کوشش کی مگر یہ آوازیں ——— وہ تصویریں کھینچنے والی آوازیں سب کچھ درہم برہم کر دیتیں۔ وہ خود کو ننگا محسوس کرتا۔ الف ننگا جس کو چاروں طرف سے لوگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔

صبح چار بجے کے قریب وہ اٹھا، باہر نکل کر اس نے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا۔ کچھ سوچا۔ وہ جھجک جو اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی اس کو کسی قدر دور کیا۔ اب ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی جو کافی تیز تھی ——— بھولو کی نگاہیں کونے کی طرف مڑیں، کلن کا گھسا ہوا ٹاٹ ہل رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ بالکل ننگ دھڑنگ لیٹا تھا۔ بھولو کو بڑی گھن آئی۔ ساتھ ہی غصہ بھی آیا کہ ہوا ایسے کوٹھوں پر کیوں چلتی ہے۔ چلتی ہے تو ٹاٹوں کو کیوں چھیڑتی ہے۔ اس کے جی میں آئی کہ کوٹھے پر جتنے ٹاٹ ہیں، سب نوچ ڈالے اور ننگا ہو کے ناچنے لگے۔

بھولو نیچے اتر گیا۔ جب کام پر نکلا تو کئی دوست ملے۔ سب نے اس سے پہلی رات کی سرگذشت پوچھی۔ پھوجے درزی نے اس کو دور ہی سے آواز دی: "کیوں استاد بھولو، کیسے رہے۔ کہیں ہمارے نام پر بٹہ تو نہیں لگا دیا تم نے؟"

چھا گھے ٹین ساز نے اس سے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا: "دیکھو اگر کوئی گڑبڑ ہے تو بتا دو۔ ایک بڑا اچھا نسخہ میرے پاس موجود ہے۔"

بالے نے اس کے کاندھے پر زور سے دھپّا مارا: "کیوں پہلوان، کیسا رہا دنگل؟"

بھولو خاموش رہا۔

صبح اس کی بیوی میکے چلی گئی۔ پانچ چھ روز کے بعد واپس آئی تو بھولو کو پھر اسی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ کوٹھے پر سونے والے جیسے اس کی بیوی کی آمد کے منتظر تھے۔ چند راتیں خاموش رہی تھیں لیکن جب وہ اوپر سوئے تو وہی کھسر پھسر، وہی چوں چوں چیں چیں، وہی کھانسنا کھنکارنا ―― وہی گھڑے کے ساتھ گلاس کے ٹکرانے کے چھناکے ―― کروٹوں پہ کروٹیں، دبی دبی ہنسی ―― بھولو ساری رات اپنی چارپائی پہ لیٹا آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اپنی دولہن کو دیکھ لیتا اور دل میں کڑھتا، مجھے کیا ہو گیا ہے ―― یہ مجھے کیا ہو گیا ہے ―― یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟

سات راتوں تک یہی ہوتا رہا، آخر تنگ آکر بھولو نے اپنی دولہن کو میکے بھیج دیا۔ بیس پچیس دن گزر گئے تو گاما نے بھولو سے کہا: "یار تم بڑے عجیب و غریب آدمی ہو، نئی نئی شادی اور بیوی کو میکے بھیج دیا۔ اتنے دن ہو گئے ہیں اسے گئے ہوئے تم اکیلے سوتے کیسے ہو؟"

بھولو نے صرف اتنا کہا "ٹھیک ہے۔"

گاما نے پوچھا: "ٹھیک کیا ہے ―― جو بات ہے بتاؤ۔ کیا تمہیں پسند نہیں آئی عائشہ؟"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے تو اور کیا بات ہے؟"

بھولو بات گول کر گیا مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد اس کے بھائی نے پھر بات چھیڑی۔ بھولو اٹھ کر کوارٹر کے باہر چلا گیا۔ چارپائی پڑی تھی اس پر بیٹھ گیا۔ اندر سے اس کو اپنی بھابی کی آواز سنائی دی۔ وہ گاما سے کہہ رہی تھی: "تم جو کہتے ہو نا کہ بھولو کو عائشہ پسند نہیں آئی، یہ غلط ہے۔"

گاما کی آواز آئی "تو اور کیا بات ہے ـــــ بھولو کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔"

"دلچسپی کیا ہو!"

"کیوں؟"

گاما کی بیوی کا جواب بھولو نہ سن سکا مگر اس کے باوجود اس کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ساری ہستی کسی نے ہاون میں ڈال کر کوٹ دی ہے۔ ایک دم گاما اونچی آواز میں بولا: "نہیں نہیں ـــــ یہ تم سے کس نے کہا؟"

گاما کی بیوی بولی "عائشہ نے اپنی کسی سہیلی سے ذکر کیا ـــــ بات اڑتی اڑتی مجھ تک پہنچ گئی۔"

بڑی صدمہ زدہ آواز میں گاما نے کہا: "یہ تو بہت برا ہوا!"

بھولو کے دل میں چھری سی پیوست ہو گئی۔ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اٹھا اور کوٹھے پر چڑھ کر جتنے ٹاٹ لگے تھے اکھیڑنے شروع کر دیے۔ کھٹ کھٹ پھٹ پھٹ سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ انہوں نے اس کو روکنے کی کوشش کی تو وہ لڑنے لگا۔ بات بڑھ گئی۔ کلن نے بانس اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ بھولو چکرا کر گرا اور

بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اس کا دماغ چل چکا تھا۔
اب وہ الف ننگا ہو کر بازاروں میں گھومتا پھرتا ہے۔ کہیں ٹاٹ لٹکا دیکھتا ہے تو اس کو اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔

شانتی

دونوں پیرے ٹرین ڈیری کے باہر بڑے دھاریوں والے چھاتے کے نیچے کرسیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ادھر سمندر تھا جس کی لہروں کی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ چائے بہت گرم تھی اس لیے دونوں آہستہ آہستہ گھونٹ بھر رہے تھے۔ سامنے موٹی بھوؤں والی یہودن کی جانی پہچانی صورت تھی۔ یہ بڑا گول مٹول چہرہ تیکھی ناک موٹے موٹے، بہت ہی زیادہ سرخی لگے ہونٹ۔ شام کو ہمیشہ درمیان والے دروازے کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھی دکھائی دیتی تھی۔ مقبول نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور برلاج سے کہا: "بیٹھی ہے جال پھینکے۔"

برلاج موٹی بھوؤں کی طرف دیکھے بغیر بولا: "پھنس جائے گی کوئی نہ کوئی مچھلی۔"

مقبول نے ایک پیسٹری منہ میں ڈالی: "یہ کاروبار بھی عجیب کاروبار ہے۔ کوئی

دکان کھول کر بیٹھتی ہے، کوئی محلہ پھر کے سودا بیچتی ہے، کوئی اس طرح ریستورانوں میں گاہک کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے ——— جسم بیچنا بھی ایک آرٹ ہے، اور میرا خیال ہے بہت مشکل آرٹ ہے ——— یہ موٹی بھووں والی کیسے گاہک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کیسے کسی مرد کو یہ بتاتی ہوگی کہ وہ بکاؤ ہے"

بلراج مسکرایا۔ "کسی روز وقت نکال کر کچھ دیر یہاں بیٹھو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ نگاہوں ہی نگاہوں میں کیونکر سودے ہوتے ہیں۔ اس جنس کا بھاؤ کیسے چکتا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک دم مقبول کا ہاتھ پکڑا۔ "ادھر دیکھو، ادھر"

مقبول نے موٹی بھووں کی طرف دیکھا۔ بلراج نے اس کا ہاتھ دبایا۔ "نہیں یار ——— ادھر کونے کے چھاتے کے نیچے دیکھو"

مقبول نے ادھر دیکھا۔ ایک دبلی پتلی، گوری چٹی لڑکی کرسی پر بیٹھی رہی تھی۔ بال کٹے ہوئے تھے۔ ناک نقشہ ٹھیک تھا ہلکے زرد رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی میں ملبوس تھی۔ مقبول نے بلراج سے پوچھا "کون ہے یہ لڑکی؟"

بلراج نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "اماں وہی ہے جس کے بارے میں تم سے کہا تھا کہ بڑی عجیب وغریب ہے"

مقبول نے کچھ دیر سوچا۔ پھر کہا "کون سی یار۔ تم تو جس لڑکی سے بھی ملتے ہو عجیب وغریب ہی ہوتی ہے"

بلراج مسکرایا "یہ بڑی خاص الخاص ہے ——— ذرا غور سے دیکھو"

مقبول نے غور سے دیکھا۔ بریدہ بالوں کا رنگ بھوسلا تھا۔ ہلکے بسنتی رنگ کی ساڑھی کے نیچے چھوٹی آستینوں والا بلاؤز۔ پتلی پتلی بہت ہی گدی بانہیں۔ لڑکی نے اپنی گردن موڑی تو مقبول نے دیکھا کہ اس کے باریک ہونٹوں پر سرخی پھیلی ہوئی سی تھی "میں اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا مگر تمہاری اس عجیب و غریب لڑکی کو سرخی استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں ہے ——— اب اور غور سے دیکھا ہے تو ساڑھی کی بناوٹ میں بھی خامیاں نظر آتی ہیں۔ بال سنوارنے کا انداز بھی ستھرا نہیں"

براج ہنسا "تم صرف خامیاں ہی دیکھتے ہو۔ اچھائیوں پر تمہاری نگاہ کبھی نہیں پڑتی"

مقبول نے کہا "جو اچھائیاں ہیں وہ آپ بیان فرما دیجئے، لیکن پہلے یہ بتا دیجئے کہ آپ اس لڑکی کو ذاتی طور پر جانتے ہیں یا ———"

لڑکی نے جب براج کو دیکھا تو مسکرائی۔ مقبول رک گیا "مجھے جواب مل گیا۔ اب آپ محترمہ کی خوبیاں بتا دیجئے"

سب سے پہلی خوبی اس لڑکی میں یہ ہے کہ بہت صاف گو ہے۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ جو اصول اس نے اپنے بنا رکھے ہیں ان پر بڑی پابندی سے عمل کرتی ہے۔ پرسنل ہائی جین کا بہت خیال رکھتی ہے۔ محبت وحبت کی بالکل قائل نہیں۔ اس معاملے میں دل اس کا برف ہے"

براج نے چار۔ کا آخری گھونٹ پیا "کہئے کیا خیال ہے؟"

مقبول نے لڑکی کو ایک نظر دیکھا "جو خوبیاں تم نے بتائی ہیں ایک ایسی عورت میں نہیں ہونی چاہئیں جس کے پاس مرد صرف اس خیال سے جاتے ہیں کہ وہ ان سے اصلی نہیں تو مصنوعی محبت ضرور کرے گی ——— خود فریبی میں اگر یہ لڑکی کسی مرد کی مدد نہیں کرتی تو میں سمجھتا ہوں بڑی بے وقوف ہے۔"

"یہی میں نے سوچا تھا ——— میں تم سے کیا بیان کر دوں، روکھے پن کی حد تک صاف گو ہے۔ اس سے باتیں کرو تو کئی بار دھکے سے لگتے ہیں ——— ایک گھنٹہ ہو گیا۔ تم نے کوئی کام کی بات نہیں کی ——— میں چلی، اور یہ جا وہ جا ——— تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے، جاؤ چلے جاؤ ——— ساڑھی کو ہاتھ مت لگاؤ، میلی ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر براج نے سگریٹ سلگایا: "عجیب و غریب لڑکی ہے۔ پہلی دفعہ جب اس سے ملاقات ہوئی تو میں بائی گوڈ چکرا گیا۔ چھوٹتے ہی مجھ سے کہا۔ ففٹی سے ایک پیسہ کم نہیں ہوگا۔ جیب میں ہیں تو چلو ورنہ مجھے اور کام ہیں۔"

مقبول نے پوچھا "نام کیا ہے اس کا؟"

"شانتی بتایا اس نے ——— کشمیرن ہے۔"

مقبول کشمیری تھا، چونک پڑا "کشمیرن!"

"تمہاری ہم وطن۔"

مقبول نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ناک نقشہ صاف کشمیریوں کا تھا "یہاں کیسے آئی؟"

"معلوم نہیں!"

"کوئی رشتے دار ہے اس کا؟" مقبول لڑکی میں دلچسپی لینے لگا۔

"وہاں کشمیر میں کوئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ یہاں بمبئی میں اکیلی رہتی ہے" براج نے سگریٹ ایش ٹرے میں دبایا: "ہارنبی روڈ پر ایک ہوٹل ہے، وہاں اس نے ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا ہے ——— یہ مجھے ایک روز اتفاقاً معلوم ہوگیا ورنہ یہ اپنے ٹھکانے کا پتہ کسی کو نہیں دیتی۔ جس کو ملنا ہوتا ہے یہاں پر سے ٹین ڈیری میں چلا آتا ہے۔ شام کو پورے پانچ بجے آتی ہے یہاں!"

مقبول کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بیرے کو اشارے سے بلایا اور اس سے بل لانے کے لیے کہا۔ اس دوران میں ایک خوش پوش نوجوان آیا اور اس لڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ مقبول براج سے مخاطب ہوا: "اس سے کبھی ملاقات کرنی چاہیئے۔"

براج مسکرایا: "ضرور ضرور ——— لیکن اس وقت نہیں۔ مصروف ہے۔ کبھی آجانا یہاں شام کو ——— اور ساتھ بیٹھ جانا۔"

مقبول نے بل ادا کیا۔ دونوں دوست اٹھ کر چلے گئے۔

دوسرے روز مقبول اکیلا آیا اور چار کا آرڈر دے کر بیٹھ گیا۔ ٹھیک پانچ بجے وہ لڑکی بس سے اتری اور پرس ہاتھ میں لٹکائے مقبول کے پاس سے گزری۔ چال بھدی تھی۔ جب وہ کچھ دور کرسی پر بیٹھ گئی تو مقبول نے سوچا: "اس میں جنسی کشش تو

نام کو بھی نہیں۔ حیرت ہے کہ اس کا کاروبار کیونکر چلتا ہے ـــــ لپ اسٹک کیسے بے ہودہ طریقے سے استعمال کی ہے اس نے ـــــ ساڑھی کی پہناوٹ آج بھی خامیوں سے بھری ہے۔

پھر اس نے سوچا کہ اس سے کیسے ملے۔ اس کی چار میز پر آچکی تھی ورنہ اٹھ کر وہ اس لڑکی کے پاس جا بیٹھتا۔ اس نے چار پینا شروع کر دی۔ اس دوران میں اس نے ایک ہلکا سا اشارہ کیا۔ لڑکی نے دیکھا۔ کچھ توقف کے بعد اٹھی اور مقبول کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مقبول پہلے تو کچھ گھبرایا لیکن فوراً ہی سنبھل کر لڑکی سے مخاطب ہوا۔

"چار شروع فرمائیں گی آپ؟"

"نہیں۔"

اس کے جوابوں کے اس اختصار میں روکھا پن تھا۔ مقبول نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا: "کشمیریوں کو تو چار کا بڑا شوق ہوتا ہے۔"

لڑکی نے بڑے بے سکلم انداز میں پوچھا: "تم چلنا چاہتے ہو میرے ساتھ؟"

مقبول کو جیسے کسی نے اوندھے منہ گرا دیا۔ گھبراہٹ میں وہ صرف اس قدر کہہ سکا "ہاں ـــــ"

لڑکی نے کہا: "ففٹی روپیز ـــــ یس اور نو؟"

یہ دوسرا ریلا تھا مگر مقبول نے اپنے قدم جما لیے "چلئے!"

مقبول نے چار کا بل ادا کیا۔ دونوں اٹھ کر ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے

میں اس نے کوئی بات نہ کی۔ لڑکی بھی خاموش رہی۔ ٹیکسی میں بیٹھے تو اس نے مقبول سے پوچھا: "کہاں جائے گا تم؟"

مقبول نے جواب دیا: "جہاں تم لے جاؤگی"۔

"ہم کچھ نہیں جانتا ——— تم بولو کدھر جائیگا؟"

مقبول کوکوئی اور جواب نہ سوجھا تو کہا: "ہم کچھ نہیں جانتا!"

لڑکی نے ٹیکسی کا دروازہ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا: "تم کیسا آدمی ہے ——— خالی پیلی جوک کرتا ہے"۔

مقبول نے اس کا ہاتھ پکڑلیا: "میں مذاق نہیں کرتا ——— مجھے تم سے صرف باتیں کرنی ہیں"۔

وہ بگڑ کر بولی: "کیا ——— تم تو بولتا تھا نمنی رو پیہ لیں!"

مقبول نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے: "یہ لو، گھبراتی کیوں ہو"۔

اس نے نوٹ لے لیئے: "تم جائے گا کہاں؟"

مقبول نے کہا: "تمہارے گھر"۔

"نہیں"۔

"کیوں نہیں"۔

"تم کو بولا ہے نہیں ——— ادھر ایسی بات نہیں ہوگی"۔

مقبول مسکرایا۔ "ٹھیک ہے ایسی بات ادھر نہیں ہوگی۔"

وہ کچھ متحیر سی ہوئی۔ "تم کیسا آدمی ہے؟"

"جیسا میں ہوں۔ تم نے بولا نفٹی روپیہ لیں کر نوٹ میں نے کہا لیں اور نوٹ تمہارے حوالے کر دیے ۔۔۔ تم نے بولا ادھر ایسی بات نہیں ہوگی۔ میں نے کہا بالکل نہیں ہوگی ۔۔۔ اب اور کیا کہتی ہو؟"

لڑکی سوچنے لگی۔ مقبول مسکرایا: "دیکھو تماشی، بات یہ ہے کل تم کو دیکھا، ایک دوست نے تمہاری کچھ باتیں سنائیں جو مجھے دلچسپ معلوم ہوئیں۔ آج میں نے تمہیں پکڑ لیا۔ اب تمہارے گھر چلتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر تم سے باتیں کروں گا اور چلا جاؤں گا ۔۔۔ کیا تمہیں یہ منظور نہیں؟"

"نہیں ۔۔۔ یہ لو اپنے نفٹی روپیہ۔" لڑکی کے چہرے پر جھنجلاہٹ تھی۔

"تمہیں بس نفٹی روپیہ کی پڑی ہے ۔۔۔ روپے کے علاوہ بھی دنیا میں اور بہت سی چیزیں ہیں ۔۔۔ چلو، ڈرائیور کو اپنا اڈریس بتاؤ ۔۔۔ میں شریف آدمی ہوں۔ تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا۔" مقبول کے انداز گفتگو میں صداقت تھی، لڑکی متاثر ہوئی۔ اس نے کچھ دیر سوچ کر کہا: "چلو ۔۔۔ ڈرائیور، ہاربنی روڈ!"

ٹیکسی چلی تو اس نے نوٹ مقبول کی جیب میں ڈال دیے۔ "یہ میں نہیں لوں گی۔"

مقبول نے اصرار نہ کیا۔ "تمہاری مرضی!"

ٹیکسی ایک پانچ منزلہ بلڈنگ کے پاس رکی۔ پہلی اور دوسری منزل پر مساس خانے

تھے۔ تیسری اور چوتھی اور پانچویں منزل ہوٹل کے لیے مخصوص تھی۔ بڑی تنگ و تاریک جگہ تھی۔ چوتھی منزل پر سیڑھیوں کے سامنے والا کمرہ شانتی کا تھا۔ اس نے پرس سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ بہت مختصر سامان تھا۔ لوہے کا ایک پلنگ جس پر اجلی چادر بچھی تھی۔ کونے میں ڈریسنگ ٹیبل۔ ایک اسٹول، اس پر ٹیبل فین۔ چار ٹرنک تھے وہ پلنگ کے نیچے دھرے تھے۔

مقبول کمرے کی صفائی سے بہت متاثر ہوا۔ ہر چیز صاف ستھری تھی۔ تکیے کے غلاف عام طور پر میلے ہوتے ہیں مگر اس کے دو نوں تکیے بے داغ غلافوں میں ملفوف تھے۔ مقبول پلنگ پر بیٹھنے لگا تو شانتی نے اسے روکا: "نہیں ــــــ ادھر بیٹھنے کی اجازت نہیں ــــــ ہم کسی کو اپنے لبستر پر نہیں بیٹھنے دیتا۔ کرسی پر بیٹھو۔" یہ کہہ کر وہ خود پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مقبول مسکرا کر کرسی پر ٹک گیا۔

شانتی نے اپنا پرس تکیے کے نیچے رکھا اور مقبول سے پوچھا: "بولو ــــــ کیا باتیں کرنا چاہتے ہو؟"

مقبول نے شانتی کی طرف غور سے دیکھا: "پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہیں ہونٹوں پر لپ اسٹک لگانی بالکل نہیں آتی۔"

شانتی نے برا نہ مانا۔ صرف اتنا کہا: "مجھے معلوم ہے۔"

"اٹھو ــــ مجھے لپ اسٹک دو۔ میں تمہیں سکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر مقبول نے اپنا رومال نکالا۔

شانتی نے اس سے کہا: "ڈریسنگ ٹیبل پر پڑا ہے، اٹھا لو۔"

مقبول نے لپ اسٹک اٹھائی۔ اسے کھول کر دیکھا: "ادھر آؤ، میں تمہارے ہونٹ پونچھوں۔"

"تمہارے رومال سے نہیں ـــــ میرا لو۔" یہ کہہ کر اس نے ٹرنک کھولا اور ایک دھلا ہوا رومال مقبول کو دیا۔ مقبول نے اس کے ہونٹ پونچھے۔ بڑی نفاست سے نئی سرخی ان پر لگائی۔ پھر کنگھی سے اس کے بال ٹھیک کیے اور کہا: "لو اب آئینہ دیکھو۔"

شانتی اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ بڑے غور سے اس نے اپنے ہونٹوں اور بالوں کا معائنہ کیا۔ پسندیدہ نظروں سے تبدیلی محسوس کی اور پلٹ کر مقبول سے صرف اتنا کہا: "اب ٹھیک ہے۔" پھر پلنگ پر بیٹھ کر پوچھا: "تمہارا کوئی بیوی ہے؟"

مقبول نے جواب دیا: "نہیں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ مقبول چاہتا تھا باتیں ہوں چنانچہ اس نے سلسلۂ کلام شروع کیا: "اتنا تو مجھے معلوم ہے کہ تم کشمیر کی رہنے والی ہو۔ تمہارا نام شانتی ہے۔ یہاں رہتی ہو ـــــ یہ بتاؤ تم نے ففٹی روپیز کا معاملہ کیوں شروع کیا؟"

شانتی نے بے تکلف جواب دیا: "میرا فادر سری نگر میں ڈاکٹر ہے ـــــ میں وہاں ہوسپٹل میں نرس تھا۔ ایک لڑکے نے مجھ کو خراب کر دیا ـــــ میں بھاگ کر ادھر کو آگئی۔ یہاں ہم کو ایک آدمی ملا۔ وہ ہم کو ففٹی روپیز دیا ـــــ بولا ہمارے ساتھ چلو، ہم گیا۔ بس کام چالو ہو گیا ـــــ ہم یہاں ہوٹل میں آگیا ـــــ پر ہم ادھر کسی سے بات نہیں کرتا ـــــ سب رنڈی لوگ ہے ـــــ کسی کو یہاں نہیں آنے دیتا۔"

مقبول نے کرید کرید کر تمام واقعات معلوم کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ کچھ اور باتیں ہوئیں جن سے اسے پتا چلا کہ شانتی کو جنسی معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جب اس کا ذکر آیا تو اس نے بڑا سا منہ بنا کر کہا: "آئی ڈونٹ لائک۔ اِٹ از بیڈ۔"

اس کے نزدیک فقط روپیہ کا معاملہ ایک کاروباری معاملہ تھا۔ سرنگر کے ہسپتال میں جب کسی لڑکے نے اس کو خراب کیا تو جاتے وقت دس روپے دینا چاہے شانتی کو بہت غصہ آیا۔ نوٹ پھاڑ دیا۔ اس واقعے کا اس کے دماغ پر یہ اثر ہوا کہ اس نے باقاعدہ کاروبار شروع کر دیا۔ پچاس روپے فیس خود بخود مقرر ہو گئی۔ اب لذت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا ——— چونکہ نرس رہ چکی تھی اس لیے بڑی محتاط رہتی تھی۔

ایک برس ہو گیا تھا اسے بمبئی آئے ہوئے۔ اس دوران میں اس نے دس ہزار روپے بچا لیے ہوتے مگر اس کو ریس کھیلنے کی لت پڑ گئی۔ پچھلی ریسوں پر اس کے پانچ ہزار اڑ گئے لیکن اس کو یقین تھا کہ وہ نئی ریسوں پر ضرور جیتے گی: "ہم سارا لوس پورا کر لے گا۔"

اس کے پاس کوڑی کوڑی کا حساب موجود تھا۔ سو روپے روزانہ کما لیتی تھی جو فوراً بنک میں جمع کرا دیے جاتے تھے۔ سو سے زیادہ وہ نہیں کمانا چاہتی تھی۔ اس کو اپنی صحت کا بہت خیال تھا۔

دو گھنٹے گزر گئے تو اس نے اپنی گھڑی دیکھی اور مقبول سے کہا: "اب تم جاؤ ——— ہم کھانا کھائے گا اور سو جائے گا۔" مقبول اٹھ کر جانے لگا تو اس نے

کہا: باتیں کرنے آؤ تو صبح کے ٹائم آؤ۔ شام کے ٹائم ہمارا نقصان ہوتی ہے۔"
مقبول نے "اچھا" کہا اور چل دیا۔

دوسرے روز صبح دس بجے کے قریب مقبول شانتی کے پاس پہونچا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی آمد پسند نہیں کرے گی گر اس نے کوئی ناگواری ظاہر نہ کی۔ مقبول دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران میں شانتی کو صحیح طریقے پر ساڑھی پہننی سکھائی۔ لڑکی ذہین تھی جلدی سیکھ گئی۔

کپڑے اس کے پاس کافی تعداد میں اور اچھے تھے۔ یہ سب کے سب اس نے مقبول کو دکھائے۔ اس میں بچپنا تھا نہ بڑھاپا۔ شباب بھی نہیں تھا۔ وہ جیسے کچھ بنتے بنتے ایک دم رک گئی تھی۔ ایک ایسے مقام پر ٹھیر گئی تھی جس کے موسم کا تعین نہیں ہو سکتا۔ وہ خوبصورت تھی نہ بدصورت۔ عورت تھی نہ لڑکی۔ وہ پھول تھی نہ کلی۔ شاخ تھی نہ تنا۔ اس کو دیکھ کر بعض اوقات مقبول کو بہت الجھن ہوتی تھی۔ وہ اس میں وہ نقطہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں اس نے غلط ملط ہونا شروع کیا تھا۔

شانتی کے متعلق اور زیادہ جاننے کے لیے مقبول نے اس سے ہر دوسرے تیسرے روز ملنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی کوئی خاطر مدارات نہیں کرتی تھی لیکن اب اس نے اس کو اپنے صاف ستھرے بستر پر بیٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک دن مقبول کو بہت تعجب ہوا جب شانتی نے اس سے کہا: "تم کوئی لڑکی مانگتا ہے؟"
مقبول لیٹا ہوا تھا چونک کر اٹھا: "کیا کہا؟"

شانتی نے کہا "ہم پوچھتی، تم کوئی لڑکی مانگتا تو ہم لاکر دیتا۔"

مقبول نے اس سے دریافت کیا کہ یہ بیٹھے بیٹھے اسے کیا خیال آیا۔ کیوں اس نے یہ سوال کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔ مقبول نے اصرار کیا تو شانتی نے اسے بتایا کہ مقبول اسے ایک بیکار عورت سمجھتا ہے۔ اس کو حیرت ہے کہ مرد اس کے پاس کیوں آتے ہیں جب کہ وہ اتنی ٹھنڈی ہے۔ مقبول اس سے باتیں کرتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ وہ اسے کھلونا سمجھتا ہے۔ آج اس نے سوچا، مجھ جیسی سادی عورتیں تو نہیں۔ مقبول کو عورت کی ضرورت ہے، کیوں نہ وہ اسے ایک منگا دے۔

مقبول نے پہلی بار شانتی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ایک دم وہ اٹھی اور چلانے لگی "ہم کچھ بھی نہیں ہے ـــــ جاؤ چلے جاؤ ـــ ہمارے پاس کیوں آتا ہے تم ـــــ جاؤ۔"

مقبول نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اٹھا اور چلا گیا۔

متواتر ایک ہفتہ وہ پیرے زین ڈیری جاتا۔ مگر شانتی دکھائی نہ دی۔ آخر ایک صبح اس نے اس کے ہوٹل کا رخ کیا۔ شانتی نے دروازہ کھول دیا مگر کوئی بات نہ کی۔ مقبول کرسی پر بیٹھ گیا ـــــ شانتی کے ہونٹوں پر سرخی پرانے بھدے طریقے پر لگی تھی۔ بالوں کا حال بھی برا تھا۔ ساڑھی کی بناوٹ تو اور بھی زیادہ بدزیب تھی۔ مقبول اس سے مخاطب ہوا "مجھ سے ناراض ہو تم ؟"

شانتی نے جواب نہ دیا اور پلنگ پر بیٹھ گئی۔ مقبول نے تند لہجے میں پوچھا "مجھ

گئیں جو میں نے سکھایا تھا؟"

شانتی خاموش رہی۔ مقبول نے غصّے میں کہا: "جواب دو ورنہ یاد رکھو مارونگا!"

شانتی نے صرف اتنا کہا: "مارو۔"

مقبول نے اٹھ کر ایک زور کا چانٹا اس کے منہ پر جڑ دیا ——— شانتی بلبلا اٹھی۔ اس کی حیرت زدہ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ مقبول نے جیب سے اپنا رومال نکالا۔ غصّے میں اس کے ہونٹوں کی بھدّی سرخی پونچھی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن مقبول اپنا کام کرتا رہا۔ لپ اسٹک اٹھا کر نئی سرخی لگائی۔ کنگھے سے اس کے بال سنوارے پھر اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا: "ساڑھی ٹھیک کرو اپنی!"

شانتی اٹھی اور ساڑھی ٹھیک کرنے لگی۔ مگر ایک دم اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور روتی روتی خود کو بستر پر گرا دیا۔ مقبول تھوڑی دیر خاموش رہا جب شانتی کے رونے کی شدت کچھ کم ہوئی تو اس کے پاس جا کر کہا: "شانتی اٹھو ——— میں جا رہا ہوں!"

شانتی نے تڑپ کر کروٹ بدلی اور چلّائی: "نہیں نہیں ——— تم نہیں جا سکتے!" اور دونوں بازو پھیلا کر دروازے کے درمیان میں کھڑی ہو گئی: "تم گیا تو مار ڈالوں گی!"

وہ ہانپ رہی تھی۔ اس کا سینہ جس کے متعلق مقبول نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا جیسے گہری نیند سے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مقبول کی حیرت زدہ آنکھوں کے

سامنے شانتی نے تلے اوپر بڑی سُرعت سے کئی رنگ بدلے۔ اس کی نمناک آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سرخی لگے باریک ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے ایک دم آگے بڑھ کر مقبول نے اس کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

دونوں پلنگ پر بیٹھے تو شانتی نے اپنا سر نیوڑھا کر مقبول کی گود میں ڈال دیا۔ اس کے آنسو بند ہونے ہی میں نہ آتے تھے۔ مقبول نے اس کو پیار کیا، رونا بند کرنے کے لیے کہا تو وہ آنسوؤں میں اٹک اٹک کر بولی "ادھر سری نگر میں — ایک آدمی نے — ہم کو مار دیا تھا — ادھر ایک آدمی نے — ہم کو زندہ کر دیا!"

دو گھنٹے کے بعد جب مقبول جانے لگا تو اس نے جیب سے پچاس روپے نکال کر شانتی کے پلنگ پر رکھے اور مسکرا کر کہا "یہ لو اپنے فغٹی روپیز!"

شانتی نے بڑے غصے اور بڑی نفرت سے نوٹ اٹھائے اور پھینک دیے۔ پھر اس نے تیزی سے اپنی ڈرسنگ ٹیبل کا ایک دراز کھولا اور مقبول سے کہا "ادھر آؤ — دیکھو یہ کیا ہے؟"

مقبول نے دیکھا۔ دراز میں سو سو کے کئی نوٹوں کے ٹکڑے پڑے تھے۔ مٹھی بھر کے شانتی نے اٹھائے اور ہوا میں اچھالے "ہم اب یہ نہیں مانگتا!"

مقبول مسکرایا ہولے سے اس نے شانتی کے گال پر چھوٹی سی چپت لگائی اور پوچھا "اب تم کیا مانگتا ہے!"

شانتی نے جواب دیا، "تم کو" یہ کہہ کر وہ مقبول کے ساتھ چمٹ گئی اور رونا شروع کر دیا۔

مقبول نے اس کے بال سنوارتے ہوئے بڑے پیار سے کہا "رو و نہیں ——— تم نے جو مانگا ہے وہ تمہیں مل گیا ہے۔"

خالد میاں

ممتاز نے صبح سویرے اٹھ کر حسبِ معمول تینوں کمروں میں جھاڑو دی، کونے کھدروں سے سگرٹوں کے ٹکڑے، ماچس کی جلی ہوئی تیلیاں اور اسی طرح کی اور چیزیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں۔ جب تینوں کمرے اچھی طرح صاف ہو گئے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس کی بیوی باہر صحن میں سو رہی تھی۔ بچّہ پنگوڑے میں تھا۔ ممتاز ہر روز صبح سویرے اٹھ کر صرف اس لیے خود تینوں کمروں میں جھاڑو دیتا تھا کہ اس کا لڑکا خالد اب چلتا پھرتا تھا اور عام بچّوں کے مانند ہر چیز جو اس کے سامنے آئے اٹھا کر منہ میں ڈال لیتا تھا۔

ممتاز ہر روز تینوں کمرے بڑی احتیاط سے صاف کرتا مگر اس کو حیرت ہوتی

خالی بوتلیں خالی ڈبے

جب خالد فرش پر سے اپنے چھوٹے چھوٹے ناخنوں کی مدد سے کوئی نہ کوئی چیز اٹھا لیتا۔ فرش کا پلستر کئی جگہ اکھڑا ہوا تھا جہاں کوڑے کرکٹ کے چھوٹے چھوٹے ذرّے پھنس جاتے تھے۔ ممتاز اپنی طرف سے پوری صفائی کرتا مگر کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا جو اس کا پلوٹھی کا بیٹا خالد جس کی عمر ابھی ایک برس کی نہیں ہوئی تھی اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیتا۔

ممتاز کو صفائی کا خبط ہو گیا تھا۔ اگر وہ خالد کو کوئی چیز فرش پر سے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈالتے دیکھتا تو وہ خود کو اس کا ملزم سمجھتا۔ اپنے آپ کو دل ہی دل میں کوستا کہ اس نے کیوں بداحتیاطی کی۔ خالد سے اس کو پیار ہی نہیں عشق تھا، لیکن عجیب بات ہے کہ جوں جوں خالد کی پہلی سالگرہ کا دن نزدیک آتا تھا اس کا وہم یقین کی صورت اختیار کرتا جاتا تھا کہ اس کا بیٹا ایک سال کا ہونے سے پہلے پہلے مر جائے گا۔

اپنے اس خوفناک وہم کا ذکر ممتاز اپنی بیوی سے بھی کر چکا تھا۔ ممتاز کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ اوہام کا بالکل قائل نہیں۔ اس کی بیوی نے جب پہلی بار اس کے منہ سے ایسی بات سنی تو کہا: "آپ اور ایسے وہم ــــ اللہ کے فضل و کرم سے ہمارا بیٹا سو سال زندہ رہے گا ــــ میں نے اس کی پہلی سالگرہ کے لیے ایسا اہتمام کیا ہے کہ آپ دنگ رہ جائیں گے۔"

یہ سن کر ممتاز کے دل کو ایک دھکا سا لگا تھا۔ وہ کب چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا زندہ نہ رہے، لیکن اس کے وہم کا کیا علاج تھا ــــ خالد بڑا تندرست بچہ تھا۔

—— سردیوں میں جب نوکر ایک دفعہ اس کو باہر سیر کے لیے لے گیا تھا تو واپس آکر اس نے ممتاز کی بیوی سے کہا تھا: "بیگم صاحب، آپ خالد میاں کے گالوں پر سرخی نہ لگایا کریں —— کسی کی نظر لگ جائے گی۔"

یہ سن کر اس کی بیوی بہت ہنسی تھی: "بیوقوف مجھے کیا ضرورت ہے سرخی لگانے کی۔ ماشاء اللہ اس کے گال ہی قدرتی لال ہیں۔"

سردیوں میں خالد کے گال بہت سرخ رہتے تھے مگر اب گرمیوں میں کچھ زردی مائل ہو گئے تھے۔ اس کو پانی کا بہت شوق تھا، چنانچہ جب وہ انگڑائی لیکر اٹھتا اور دودھ کی بوتل پی لیتا تو دفر مجانے سے پہلے ممتاز اس کو پانی کی بالٹی میں کھڑا کر دیتا۔ دیر تک وہ پانی کے چھینٹے اڑا اڑا کر کھیلتا رہتا۔ ممتاز اور اس کی بیوی خالد کو دیکھتے اور بہت خوش ہوتے۔ لیکن ممتاز کی خوشی میں غم کا ایک برقی دھکا سا ضرور ہوتا۔ وہ سوچتا، خدا میری بیوی کی زبان مبارک کرے، لیکن یہ کیا ہے کہ مجھے اس کی موت کا کھٹکا رہتا ہے —— یہ وہم کیوں میرے دل و دماغ میں بیٹھ گیا ہے کہ یہ مر جائے گا —— کیوں مرے گا؟ —— اچھا بھلا صحت مند ہے۔ اپنی عمر کے بچوں سے کہیں زیادہ صحت مند —— میں یقیناً پاگل ہوں، اس سے میری حد سے زیادہ بڑھی ہوئی محبت دراصل اس وہم کا باعث ہے —— لیکن مجھے اس سے اتنی زیادہ محبت کیوں ہے؟ —— کیا سارے باپ اسی طرح بچوں سے پیار کرتے ہیں —— کیا ہر باپ کو اپنی اولاد کی موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے؟ —— مجھے آخر ہو

کیا گیا ہے؟

ممتاز نے جب، حسبِ معمول نینوں کمرے اچھی طرح صاف کر دیے تو وہ فرش پر چٹائی بچھا کر لیٹ گیا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ صبح اٹھ کر جھاڑو وغیرہ دے کر وہ گرمیوں میں ضرور آدھے گھنٹے کے لیے چٹائی پر لیٹا کرتا تھا، بغیر تکیے کے اس طرح اس کو لطف محسوس ہوتا تھا۔

لیٹ کر وہ سوچنے لگا "پرسوں میرے بچّے کی پہلی سالگرہ ہے — اگر یہ بخیر و عافیت گزر جائے تو میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا، یہ میرا وہم بالکل دور ہو جائے گا — اللہ میاں یہ سب تیرے ہاتھ میں ہے"۔

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دفعتہً اس نے اپنے ننگے سینے پر بوجھ سا محسوس کیا۔ آنکھیں کھولیں تو دیکھا خالد ہے، اس کی بیوی پاس کھڑی تھی۔ اس نے کہا "ساری رات بے چین سا رہا ہے، سوتے میں جیسے ڈر ڈر کے کانپتا رہا ہے"۔

خالد، ممتاز کے سینے پر زور سے کانپا۔ ممتاز نے اس پر ہاتھ رکھا اور کہا "خدا میرے بیٹے کا محافظ ہو!"

ممتاز کی بیوی نے خفگی آمیز لہجے میں کہا "توبہ، آپ کو لبس وہموں نے گھیر رکھا ہے۔ ہلکا سا بخار ہے انشاءاللہ دور ہو جائے گا"۔

یہ کہہ کر ممتاز کی بیوی کمرے سے باہر چلی گئی۔ ممتاز نے ہولے ہولے بڑے پیار سے خالد کو تھپکنا شروع کیا جو اس کی چھاتی پر اوندھا لیٹا تھا اور سوتے میں کبھی

کبھی کانپ اٹھتا تھا۔ تھپکنے سے وہ جاگ پڑا۔ آہستہ آہستہ اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھولیں اور باپ کو دیکھ کر مسکرایا۔ ممتاز نے اس کا منہ چوما: "کیوں میاں خالد! کیا بات ہے ـــــ آپ کانپتے کیوں تھے؟"

خالد نے مسکرا کر اپنا اٹھا ہوا سر باپ کی چھاتی پر گرا دیا۔ ممتاز نے پھر اس کو تھپکنا شروع کر دیا۔ دل میں وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ اس کے بیٹے کی عمر دراز ہو۔ اس کی بیوی نے خالد کی پہلی سالگرہ کے لیے بڑا اہتمام کیا تھا اپنی ساری سہیلیوں سے کہا تھا کہ وہ اس تقریب پر ضرور آئیں۔ درزی سے خاص طور پر اس کی سالگرہ کے کپڑے سلوائے تھے۔ دعوت پر کیا کیا چیز ہوگی، یہ سب سوچ لیا تھا ـــــ ممتاز کو یہ ٹھاٹ پسند نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی کو خبر نہ ہو اور سالگرہ گزر جائے۔ خود اس کو بھی پتہ نہ چلے اور اس کا بیٹا ایک سال کا ہو جائے۔ اس کو اس بات کا علم صرف اس وقت ہو جب خالد ایک برس اور کچھ دنوں کا ہو گیا ہو۔

خالد اپنے باپ کی چھاتی پر سے اٹھا۔ ممتاز نے اس سے محبت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا: "خالد بیٹا، سلام نہیں کرو گے اباجی کو؟"

خالد نے مسکرا کر ہاتھ اٹھایا اور اپنے سر پر رکھ دیا۔ ممتاز نے اس کو دعا دی۔ "جیتے رہو!" لیکن یہ کہتے ہی اس کے دل پر اس کے وہم کی ضرب لگی اور وہ غم و فکر کے سمندر میں غرق ہو گیا۔

خالد سلام کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ دفتر جانے میں ابھی کافی وقت تھا۔

خالی بوتلیں خالی ڈبے

ممتاز چٹائی پر لیٹا رہا اور اپنے وہم کو دل و دماغ سے محو کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اتنے میں باہر صحن سے اس کی بیوی کی آواز آئی "ممتاز صاحب، ممتاز صاحب ——— ادھر آیئے۔"

آواز میں شدید گھبراہٹ تھی۔ ممتاز چونک کر اٹھا۔ دوڑ کر باہر گیا۔ دیکھا کہ اس کی بیوی خالد کو غسل خانے کے باہر گود میں لیے کھڑی ہے اور وہ اس کی گود میں بل پہ بل کھا رہا ہے ——— ممتاز نے اس کو اپنی باہنوں میں لیا اور بیوی سے جو کانپ رہی تھی پوچھا "کیا ہوا؟"

اس کی بیوی نے خوفزدہ لہجے میں کہا "معلوم نہیں ——— پانی سے کھیل رہا تھا ——— میں نے ناک صاف کی تو دوہرا ہو گیا۔"

ممتاز کی باہنوں میں خالد ایسے بل کھا رہا تھا، جیسے کوئی اسے کپڑے کی طرح نچوڑ رہا ہے۔ سامنے چارپائی پڑی تھی۔ ممتاز نے اس کو وہاں لٹا دیا۔ میاں بیوی سخت پریشان تھے۔ وہ پڑا بل پہ بل کھا رہا تھا اور ان دونوں کے اوسان خطا تھے کہ وہ کیا کریں۔ تھپکایا، چوما، پانی کے چھینٹے مارے مگر اس کا تشنج دور نہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد خود بخود دورہ آہستہ آہستہ ختم ہو گیا اور خالد پر بے ہوشی سی طاری ہو گئی۔ ممتاز نے سمجھا، مر گیا ہے چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہا "ختم ہو گیا۔"

وہ چلّائی "لاحول ولا ——— کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں کنولشن تھی ختم ہو گئی، ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

خالد نے اپنی مرجھائی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کھولیں اور اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ممتاز کی ساری دنیا زندہ ہوگئی۔ بڑے ہی درد بھرے پیار سے اس نے خالد سے کہا "کیوں خالد بیٹا ـــــ یہ کیا ہوا تھا آپ کو؟"

خالد کے ہونٹوں پر تشنج زدہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ممتاز نے اس کو گود میں اٹھا لیا اور اندر کمرے میں لے گیا۔ لٹانے ہی والا تھا کہ دوسری کنولشن آئی خالد پھر بل کھانے لگا جس طرح مرگی کا دورہ ہوتا ہے۔ یہ تشنج بھی اسی قسم کا تھا۔ ممتاز کو ایسا محسوس ہوتا کہ خالد نہیں بلکہ وہ خود اس اذیت کے شکنجے میں کسا جا رہا ہے۔

دوسرا دورہ ختم ہوا تو خالد اور زیادہ مرجھا گیا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دھنس گئیں۔ ممتاز اس سے باتیں کرنے لگا۔

"خالد بیٹے، یہ کیا ہوتا ہے آپ کو؟"

"خالد میاں، اٹھو نا ـــــ چلو پھرو!"

"خالدی ـــــ مکھن کھائیں گے آپ؟"

خالد کو مکھن بہت پسند تھا مگر اس نے یہ سن کر اپنا سر ہلا کر ہاں نہ کی۔ لیکن جب ممتاز نے کہا "بیٹے، گگو کھائیں گے آپ؟" تو اس نے بڑے خفیف انداز میں ہاں کے طور پر اپنا سر ہلایا۔ ممتاز مسکرایا اور خالد کو اپنے گلے سے لگا لیا پھر اس کو اپنی بیوی کے حوالے کیا اور اس سے کہا "تم اس کا دھیان رکھو میں

خالی ہوتیں خالی ڈبے

ڈاکٹر لے کر آیا ہوں"۔

ڈاکٹر ساتھ لے کر آیا تو ممتاز کی بیوی کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ اس کی غیر حاضری میں خالد پر تشنج کے تین اور دورے پڑ چکے تھے۔ ان کے باعث وہ بے جان سا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور کہا: "تردد کی کوئی بات نہیں ایسی کنولشن بچّوں کو عموماً آیا کرتی ہے ــــــ اس کی وجہ دانت ہیں۔ معدے میں کرم وغیرہ ہوں تو وہ بھی اس کا باعث ہو سکتے ہیں ــــــ میں دوا لکھ دیتا ہوں، آرام آجائے گا۔ بخار تیز نہیں ہے۔ آپ کوئی فکر نہ کریں"۔

ممتاز نے دفتر سے چھٹی لے لی اور سارا دن خالد کے پاس بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد اس کو دو مرتبہ اور دورے پڑے۔ اس کے بعد وہ نڈھال لیٹا رہا۔

شام ہو گئی تو ممتاز نے سوچا: شاید اب اللہ کا فضل ہو گیا ہے ــــــ اتنے عرصے میں کوئی کنولشن نہیں آئی ــــــ خدا کرے رات اسی طرح کٹ جائے"۔

ممتاز کی بیوی خوش تھی: "اللہ تعالیٰ نے چاہا تو کل میرا خالد ویسا ہی بھلا چنگا ہو جائے گا"۔

رات کو چونکہ مقررہ اوقات پر دوا دینی تھی، اس لیے ممتاز چارپائی پر نہ لیٹا کہ شاید سو جائے۔ خالد کے پنگوڑے کے پاس آرام کرسی رکھ کر وہ بیٹھ گیا اور ساری رات جاگتا رہا کیونکہ خالد بے چین تھا، کانپ کانپ کر بار بار جاگتا تھا، حرارت بھی تیز تھی۔

صبح سات بجے کے قریب ممتاز نے تھرما میٹر لگا کے دیکھا تو ایک سو چار ڈگری بخار تھا۔ ڈاکٹر بلایا۔ اس نے کہا: "تردد کی کوئی بات نہیں۔ برونکائیٹس ہے۔ میں نسخہ لکھ دیتا ہوں۔ تین چار روز میں آرام آجائے گا!"

ڈاکٹر نسخہ لکھ کر چلا گیا۔ ممتاز دوا بنوا لایا۔ خالد کو ایک خوراک پلائی۔ مگر اس کو تسکین نہ ہوئی۔ دس بجے کے قریب وہ ایک بڑا ڈاکٹر لایا۔ اس نے اچھی طرح خالد کو دیکھا اور تسلی دی، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ——— سب ٹھیک ہو جائے گا!"

سب ٹھیک نہ ہوا۔ بڑے ڈاکٹر کی دوا نے کوئی اثر نہ کیا۔ بخار تیز ہوتا گیا۔

ممتاز کے نوکر نے کہا: "صاحب، بیماری وغیرہ کوئی نہیں ——— خالد میاں کو نظر لگ گئی ہے۔ میں ایک تعویذ لکھوا کر لایا ہوں۔ اللہ کے حکم سے یوں چٹکیوں میں اثر کرے گا!"

سات کنوؤں کا پانی اکٹھا کیا گیا۔ اس میں یہ تعویذ گھول کر خالد کو پلایا گیا۔ کوئی اثر نہ ہوا۔ ہمسائی آئی، وہ ایک یونانی دوا تجویز کر گئی۔ ممتاز یہ دوا لے آیا مگر اس نے خالد کو نہ دی۔ شام کو ممتاز کا ایک رشتہ دار آیا۔ ساتھ اس کے ایک ڈاکٹر تھا۔ اس نے خالد کو دیکھا اور کہا: "ملیریا ہے ——— اتنا بخار ملیریا ہی میں ہوتا ہے۔ ——— آپ اس پر برف کا پانی ڈالیے میں کونین کا انجکشن دیتا ہوں!"

برف کا پانی ڈالا گیا۔ بخار ایک دم کم ہو گیا۔ درجہ حرارت اٹھانوے ڈگری تک آگیا۔ ممتاز اور اس کی بیوی کی جان میں جان آئی۔ لیکن تھوڑے سے ہی عرصے میں

خالی بوتلیں خالی ڈبے

بخار بہت ہی تیز ہو گیا۔ ممتاز نے تھرمامیٹر لگا کر دیکھا، درجہ حرارت ایک سو چھ تک پہنچ گیا تھا۔

ہمسائی آئی۔ اس نے خالد کو مایوس نظروں سے دیکھا اور ممتاز کی بیوی سے کہا: "بچّے کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا ہے۔"

ممتاز اور اس کی بیوی کے دل بیٹھ گئے۔ ممتاز نے نیچے کارخانے سے ہسپتال فون کیا۔ ہسپتال والوں نے کہا مریض کو لے آؤ۔ ممتاز نے فوراً ٹانگہ منگوایا۔ خالد کو گود میں لیا۔ بیوی کو ساتھ بٹھایا اور ہسپتال کا رخ کیا۔ سارا دن وہ پانی پیتا رہا تھا مگر پیاس تھی کہ بجھتی ہی نہیں تھی۔ ہسپتال جاتے ہوئے راستے میں اس کا حلق بے حد خشک ہو گیا۔ اس نے سوچا اتر کر کسی دکان سے ایک گلاس پانی پی لے۔ لیکن خدا معلوم کہاں سے یہ وہم ایک دم اس کے دماغ میں آن ٹپکا: "دیکھو اگر تم نے پانی پیا تو تمہارا خالد مر جائے گا!"

ممتاز کا حلق سوکھ کے لکڑی ہو گیا مگر اس نے پانی نہ پیا۔ ہسپتال کے قریب ٹانگہ پہنچا تو اس نے سگریٹ سلگایا۔ دو ہی کش لیے تھے تو اس نے ایک دم سگریٹ پھینک دیا۔ اس کے دماغ میں یہ وہم گونجا تھا: "ممتاز سگریٹ نہ پیو تمہارا بچہ مر جائیگا۔"

ممتاز نے ٹانگہ ٹھہرایا۔ اس نے سوچا: "یہ کیا حماقت ہے — یہ وہم سب فضول ہیں۔ سگریٹ پینے سے بچے پر کیا آفت آ سکتی ہے۔"

ٹانگے سے اتر کر اس نے سڑک پر سے سگریٹ اٹھایا، واپس ٹانگے میں بیٹھ کر

جب اس نے کش لینا چاہا تو کسی نامعلوم طاقت نے اس کو روکا: "نہیں ممتاز ایسا نہ کرو، خالد مر جائے گا۔"

ممتاز نے سگریٹ زور سے پھینک دیا ـــــ ٹانگے والے نے گھوم کے اس کو دیکھا۔ ممتاز نے محسوس کیا کہ جیسے اس کو اس کی دماغی کیفیت کا علم ہے اور وہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ اپنی خفت دور کرنے کی خاطر اس نے ٹانگے والے سے کہا: "خراب ہو گیا تھا سگریٹ" یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک نیا سگریٹ نکالا۔ سلگانا چاہا مگر ڈر گیا۔ اس کے دل و دماغ میں ہلچل سی مچ گئی ادراک کہتا تھا کہ یہ اوہام سب فضول ہیں مگر کوئی ایسی آواز تھی، کوئی ایسی طاقت تھی جو اس کی منطق، اس کے استدلال، اس کے ادراک پر غالب آجاتی تھی۔

ٹانگہ ہسپتال کے پھاٹک میں داخل ہوا تو اس نے سگریٹ انگلیوں میں مسل کر پھینک دیا۔ اس کو اپنے اوپر بہت ترس آیا کہ وہ اوہام کا غلام بن گیا ہے۔

ہسپتال والوں نے فوراً ہی خالد کو داخل کر لیا۔ ڈاکٹر نے دیکھا اور کہا: "برونکو نمونیا ہے، حالت مخدوش ہے۔"

خالد بے ہوش تھا۔ ماں اس کے سرہانے بیٹھی ویران نگاہوں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ کمرے کے ساتھ غسل خانہ تھا۔ ممتاز کو سخت پیاس لگ رہی تھی۔ نل کھول کر اوک سے پانی پینے لگا تو پھر وہی وہم اس کے دماغ میں گونجا: "ممتاز، یہ کیا کر رہے ہو، تم مت پانی پیئو ـــــ تمہارا خالد مر جائے گا۔"

ممتاز نے دل میں اس وہم کو کالی دی اور انتقاماً اتنا پانی پیا کہ اس کا پیٹ ابھر گیا۔ پانی پی کر غسل خانے سے باہر آیا تو اس کا خالد اسی طرح مرجھایا ہوا بے ہوش ہسپتال کے آہنی پلنگ پر پڑا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہیں بھاگ جائے —— اس کے ہوش و حواس غائب ہوجائیں —— خالد اچھا ہو جائے اور وہ اس کے بدلے نمونیا میں گرفتار ہو جائے۔

ممتاز نے محسوس کیا کہ خالد اب پہلے سے زیادہ زرد ہے۔ اس نے سوچا، یہ سب اس کے پانی پینے کا باعث ہے .... اگر وہ پانی نہ پیتا تو ضرور خالد کی حالت بہتر ہو جاتی۔ اس کو بہت دکھ ہوا۔ اس نے خود کو بہت لعنت، ملامت کی مگر پھر اس کو خیال آیا کہ جس نے یہ بات سوچی تھی کہ وہ ممتاز نہیں کوئی اور تھا —— یہ اور کون تھا؟ —— کیوں اس کے دماغ میں ایسے وہم پیدا ہوتے تھے۔ پیاس لگی تھی، پانی پی لیا۔ اس سے خالد پر کیا اثر پڑ سکتا ہے —— خالد ضرور اچھا ہو جائے گا —— پرسوں اس کی سالگرہ ہے، انشاء اللہ خوب ٹھاٹ سے منائی جائے گی۔

لیکن فوراً ہی اس کا دل بیٹھ جاتا۔ کوئی آواز اس سے کہتی "خالد ایک برس کا ہونے بھی نہیں پائے گا —— ممتاز کا جی چاہتا کہ وہ اس آواز کی زبان پکڑ لے اور اسے گدی سے نکال دے مگر یہ آواز تو خود اس کے دماغ میں پیدا ہوتی تھی۔ خدا معلوم کیسے ہوتی تھی، کیوں ہوتی تھی۔

ممتاز اس قدر تنگ آ گیا کہ اس نے دل ہی دل میں اپنے اوہام سے گڑگڑا کر کہا خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو ۔۔۔۔ کیوں تم مجھ غریب کے پیچھے پڑ گئے ہو؟"

شام ہو چکی تھی۔ کئی ڈاکٹر خالد کو دیکھ چکے تھے۔ دوا دی جا رہی تھی۔ کئی انجکشن بھی لگ چکے تھے مگر خالد ابھی تک بے ہوش تھا۔ دفعتہ ممتاز کے دماغ میں یہ آواز گونجی:

"تم یہاں سے چلے جاؤ ۔۔۔۔ فوراً چلے جاؤ، ورنہ خالد مر جائیگا!"

ممتاز کمرے سے باہر چلا گیا۔ ہسپتال سے باہر چلا گیا۔ اس کے دماغ میں آوازیں گونجتی رہیں۔ اس نے اپنے آپ کو ان آوازوں کے حوالے کر دیا۔ اپنی ہر جنبش، اپنی ہر حرکت ان کے حکم کے سپرد کر دی ۔۔۔۔ یہ اسے ایک ہوٹل میں لے گئیں۔ انھوں نے اس کو شراب پینے کے لیے کہا۔ شراب آئی تو اسے پھینک دینے کا حکم دیا۔ ممتاز نے ہاتھ سے گلاس پھینک دیا تو اور منگانے کے لیے کہا۔ دوسرا گلاس آیا تو اسے بھی پھینک دینے کے لیے کہا۔

شراب اور ٹوٹے ہوئے گلاسوں کے بل ادا کر کے ممتاز باہر نکلا۔ اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ہے ۔۔۔۔ صرف اس کا دماغ ہے جہاں شور برپا ہے۔ چلتا چلتا وہ ہسپتال پہنچ گیا۔ خالد کے کمرے کا رخ کیا تو اسے حکم ہوا: "مت جاؤ ادھر ۔۔۔۔ تمہارا خالد مر جائے گا۔"

وہ لوٹ آیا ۔۔۔۔ گھاس کا میدان تھا۔ وہاں ایک بنچ پڑی تھی، اس پر لیٹ گیا۔ ۔۔۔۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ میدان میں اندھیرا تھا۔ چاروں طرف خاموشی

تھی کبھی کبھی کسی موٹر کے ہارن کی آواز اس خاموشی میں خراش پیدا کرتی ہوئی گزرجاتی۔ سامنے اونچی دیوار میں ہسپتال کا روشن کلاک تھا ——— ممتاز خالد کے متعلق سوچ رہا تھا: کیا وہ بچ جائے گا ——— وہ بچے کیوں پیدا ہوتے ہیں جنہیں مرنا ہوتا ہے ——— وہ زندگی کیوں پیدا ہوتی ہے جسے اتنی جلدی موت کے منہ میں چلا جانا ہوتا ہے ——— خالد ضرور ———"

ایک دم اس کے دماغ میں ایک وہم پھوٹا۔ بنچ پر سے اتر کر وہ سجدے میں گر گیا۔ حکم تھا اسی طرح پڑے رہو جب تک خالد ٹھیک نہ ہو جائے۔ ممتاز سجدے میں پڑا رہا۔ وہ دعا مانگنا چاہتا تھا مگر حکم تھا کہ مت مانگو۔ ممتاز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ خالد کے لیے نہیں، اپنے لیے دعا مانگنے لگا: "خدایا مجھے اس اذیت سے نجات دے ——— تجھے اگر خالد کو مارنا ہے تو مار دے، یہ میرا کیا حشر کر رہا ہے تو!"

دفعتاً اسے آوازیں سنائی دیں۔ اس سے کچھ دور دو آدمی کرسیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے:

"بچہ بڑا خوبصورت ہے۔"

"ماں کا حال تو مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔"

"بے چاری ہر ڈاکٹر کے پاؤں پڑ رہی تھی۔"

"ہم نے اپنی طرف سے تو ہر ممکن کوشش کی۔"

"بچنا محال ہے۔"

"میں نے بھی کہا تھا ماں سے کہ دعا کرو بہن!"

ایک ڈاکٹر نے ممتاز کی طرف دیکھا جو سجدے میں پڑا تھا۔ اس کو زور سے آواز دی "ارے، کیا کر رہا ہے تو ۔۔۔ ادھر آ"

ممتاز اٹھ کر دونوں ڈاکٹروں کے پاس گیا۔ ایک نے اس سے پوچھا "کون ہو تم؟"

ممتاز نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر جواب دیا "جی، میں ایک مریض ۔"

ڈاکٹر نے سختی سے کہا "مریض ہو تو اندر جاؤ ۔۔۔ یہاں میدان میں ڈنٹر کیوں پیلتے ہو؟"

ممتاز نے کہا "جی، میرا بچہ ہے ۔۔۔ ادھر اس وارڈ میں۔"

"وہ تمہارا بچہ ہے جو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"جی ہاں ۔۔۔ شاید آپ اسی کی باتیں کر رہے تھے ۔۔ وہ میرا بچہ ہے ۔۔ خالد۔"

"آپ اس کے باپ ہیں؟"

ممتاز نے اپنا غم واندوہ سے بھرا ہوا سر ہلایا "جی ہاں، میں اس کا باپ ہوں۔"

ڈاکٹر نے کہا "آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ جائیے آپ کی وائف بہت پریشان ہیں۔"

"جی اچھا" کہہ کر ممتاز وارڈ کی طرف روانہ ہوا۔ سیڑھیاں طے کر کے جب اوپر پہونچا تو کمرے کے باہر اس کا نوکر رو رہا تھا۔ ممتاز کو دیکھ کر اور زیادہ رونے لگا۔ "صاحب! خالد میاں فوت ہو گئے۔"

ممتاز اندر کمرے میں گیا۔ اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ ایک ڈاکٹر اور نرس اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ممتاز پلنگ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ خالد آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ اس کے چہرے پر موت کا سکون تھا۔ ممتاز نے اس کے ریشمیں بالوں پر ہاتھ پھیرا اور دل چیر دینے والے لہجے میں اس سے پوچھا "خالد میاں ——— گگو کھائیں گے آپ؟"

خالد کا سر نفی میں نہ ہلا۔ ممتاز نے پھر درخواست بھرے لہجے میں کہا "خالد میاں ——— میرے وہم لے جائیں گے اپنے ساتھ؟"

ممتاز کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے خالد نے سر ہلا کر ہاں کی ہے۔

دو قومیں

مختار نے شاردا کو پہلی مرتبہ جھرنوں میں سے دیکھا۔ وہ اوپر کوٹھے پر کٹا ہوا پتنگ لینے گیا تو اسے جھرنوں میں سے ایک جھلک دکھائی دی۔ سامنے والے مکان کی بالائی منزل کی کھڑکی کھلی تھی۔ ایک لڑکی ڈونگا ہاتھ میں لیے نہا رہی تھی۔ مختار کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ لڑکی کہاں سے آ گئی، کیونکہ سامنے والے مکان میں کوئی لڑکی نہیں تھی۔ جو تھیں، بیاہی جا چکی تھیں، صرف روپ کور تھی۔ اس کا پلپلا خاوند کالو مل تھا۔ ان کے تین لڑکے تھے اور بس۔

مختار نے پتنگ اٹھایا اور ٹھٹک کے رہ گیا ــــــ لڑکی بہت خوبصورت تھی۔ اس کے ننگے بدن پر سنہرے روئیں تھے۔ ان میں پھنسی ہوئی پانی کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ اس کا رنگ ہلکا سانولا تھا، سانولا بھی نہیں، تانبے کے رنگ

جیسا۔ پانی کی ننھی ننھی بوندنیاں ایسی لگتی تھیں جیسے اس کا بدن پگھل کر قطرے قطرے بن کر گر رہا ہے۔

مختار نے جھرنے کے سوراخوں کے ساتھ اپنی آنکھیں جما دیں اور اس لڑکی کو جو ڈونگا ہاتھ میں لیے نہا رہی تھی، دلچسپی اور غور سے دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ سولہ برس کی تھی۔ گیلے سینے پر اس کی چھوٹی چھوٹی گول چھاتیاں جن پر پانی کے قطرے پھسل رہے تھے بڑی دل فریب تھیں۔ اس کو دیکھ کر مختار کے دل و دماغ میں سفلی جذبات پیدا نہ ہوئے۔ ایک جوان خوبصورت، اور بالکل ننگی لڑکی اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ مختار کے اندر شہوانی ہیجان برپا ہو جاتا، مگر وہ بڑے ٹھنڈے انہماک سے اسے دیکھ رہا تھا جیسے کسی مصوّر کی تصویر دیکھ رہا ہے۔

لڑکی کے نچلے ہونٹ کے اختتامی کونے پر بڑا سا تل تھا ــــ بے حد متین، بے حد سنجیدہ، جیسے وہ اپنے وجود سے بے خبر ہے، لیکن دوسرے اس کے وجود سے آگاہ ہیں، صرف اس حد تک کہ اسے وہیں ہونا چاہیئے تھا جہاں کہ وہ تھا۔

بانہوں پر سنہرے روئیں پانی کی بوندوں کے ساتھ لپٹے ہوئے چمک رہے تھے۔ اس کے سر کے بال سنہرے نہیں، بھوسلے تھے جنہوں نے شاید سنہرے ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ جسم سڈول اور گدرایا ہوا تھا لیکن اس کو دیکھنے سے اشتعال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مختار دیر تک جھرنے کے ساتھ آنکھیں جمائے رہا۔

لڑکی نے بدن پر صابن ملا۔ مختار تک اس کی خوشبو پہونچی۔ سلونے، تانبے جیسے رنگ والے بدن پر سفید سفید جھاگ بڑے سہانے معلوم ہوتے تھے پھر جب یہ جھاگ پانی کے بہاؤ سے پھسلے تو مختار نے محسوس کیا جیسے اس لڑکی نے اپنا ململ کا لباس بڑے اطمینان سے اتار کر ایک طرف رکھ دیا ہے۔

غسل سے فارغ ہو کر لڑکی نے تولئے سے اپنا بدن پونچھا۔ بڑے سکون اور اطمینان سے آہستہ آہستہ کپڑے پہنے۔ کھڑکی کے ڈنڈے پر دونوں ہاتھ رکھے اور سامنے دیکھا۔ ایک دم اس کی آنکھیں شرماہٹ کی جھیلوں میں غرق ہو گئیں۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ مختار بے اختیار ہنس پڑا۔

لڑکی نے فوراً کھڑکی کے پٹ کھولے اور بڑے غصّے میں جھرنے کی طرف دیکھا۔ مختار نے کہا: "میں بالکل قصوروار نہیں ——— آپ کیوں کھڑکی کھول کر نہا رہی تھیں"

لڑکی نے کچھ نہ کہا۔ غیض آلود نگاہوں سے جھرنے کو دیکھا اور کھڑکی بند کر لی۔

چوتھے دن روپ کور آئی۔ اس کے ساتھ یہی لڑکی تھی۔ مختار کی ماں اور بہن دونوں سلائی اور کروشیے کے کام کی ماہر تھیں، گلی کی اکثر لڑکیاں ان سے یہ کام سیکھنے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ روپ کور بھی اس لڑکی کو اسی غرض سے لائی تھی کیونکہ اس کو کروشیے کے کام کا بہت شوق تھا۔ مختار اپنے کمرے سے نکل کر صحن

میں آیا تو اس نے روپ کور کو پرنام کیا۔ لڑکی پر اس کی نگاہ پڑی تو وہ سمٹ سی گئی۔ مختار مسکرا کر وہاں سے چلا گیا۔

لڑکی روزانہ آنے لگی۔ مختار کو دیکھتی تو سمٹ جاتی۔ آہستہ آہستہ اس کا یہ ردِ عمل دور ہوا اور اس کے دماغ سے یہ خیال کبھی تدر محو ہوا کہ مختار نے اسے نہاتے دیکھا تھا۔

مختار کو معلوم ہوا کہ اس کا نام شاردا ہے۔ روپ کور کے چچا کی لڑکی یتیم ہے پیچھے کی ملیاں میں ایک غریب رشتہ دار کے ساتھ رہتی تھی۔ روپ کور نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔ انٹرنس پاس ہے۔ بڑی ذہین ہے، کیونکہ اس نے کروشیے کا مشکل سے مشکل کام یوں چٹکیوں میں سیکھ لیا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ اس دوران میں مختار نے محسوس کیا کہ وہ شاردا کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ دھیرے دھیرے ہوا۔ جب مختار نے اس کو پہلی بار جھرنے میں سے دیکھا تھا تو اس وقت اس کے سامنے ایک نظارہ تھا۔ بڑا فرحت ناک نظارہ۔ لیکن اب شاردا آہستہ آہستہ اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ مختار نے کئی دفعہ سوچا تھا کہ یہ محبت کا معاملہ بالکل غلط ہے۔ اس لیے کہ شاردا ہندو ہے۔ مسلمان کیسے ایک ہندو لڑکی سے محبت کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ مختار نے اپنے آپ کو بہت سمجھایا لیکن وہ اپنے محبت کے جذبے کو مٹا نہ سکا۔

شاردا اب اس سے باتیں کرنے لگی تھی مگر کھُل کے نہیں۔ اس کے دماغ میں مختار کو دیکھتے ہی یہ احساس بیدار ہو جاتا تھا کہ وہ ننگی نہارہی تھی اور مختار بھرنے میں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ایک روز گھر میں کوئی نہیں تھا۔ مختار کی ماں اور بہن دونوں کسی عزیز کے چالیسواں پر گئی ہوئی تھیں۔ شاردا حسبِ معمول اپنا تھیلا اٹھائے صبح دس بجے آئی۔ مختار صحن میں چارپائی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔ شاردا نے اس سے پوچھا: "بہن جی کہاں ہیں؟"

مختار کے ہاتھ کانپنے لگے "وہ —— وہ کہیں باہر گئی ہے۔"

شاردا نے پوچھا: "ماتا جی؟"

مختار اٹھ کر بیٹھ گیا "وہ —— وہ بھی اس کے ساتھ ہی گئی ہیں۔"

"اچھا!" یہ کہہ کر شاردا نے کسی قدر گھبرائی ہوئی نگاہوں سے مختار کو دیکھا اور نمستے کر کے چلنے لگی۔ مختار نے اس کو روکا: "ٹھیرو شاردا!"

شاردا کو جیسے بجلی کے کرنٹ نے چھو لیا۔ چونک کر رگ گئی: "جی؟"

مختار چارپائی پر سے اٹھا: "بیٹھ جاؤ —— وہ لوگ ابھی آجائیں گے۔"

"جی نہیں —— میں جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر بھی شاردا کھڑی رہی۔

مختار نے بڑی جرأت سے کام لیا۔ آگے بڑھا۔ اس کی ایک کلائی پکڑی اور کھینچ کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ یہ سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ مختار اور شاردا

دونوں کو ایک لمحے کے لیے بالکل پتا نہ چلا کہ کیا ہوا ہے —— اس کے بعد دونوں ہانپنے لگے۔ مختار نے صرف اتنا کہا "مجھے معاف کر دینا!"

شاردا خاموش کھڑی رہی۔ اس کا تکیے نے جیسا رنگ سُرخی مائل ہو گیا۔ ہونٹوں میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی جیسے وہ چھیڑے جانے پر شکایت کر رہے ہیں۔ مختار اپنی حرکت اور اس کے نتائج بھول گیا۔ اس نے ایک بار پھر شاردا کو اپنی طرف کھینچا اور سینے کے ساتھ بھینچ لیا —— شاردا نے مزاحمت نہ کی۔ وہ صرف مجسمۂ حیرت بنی ہوئی تھی۔ وہ ایک سوال بن گئی تھی —— ایک ایسا سوال جو اپنے آپ سے کیا گیا ہو۔ وہ شاید خود سے پوچھ رہی تھی "یہ کیا ہوا ہے، یہ کیا ہو رہا ہے —— کیا اسے ہونا چاہیئے تھا —— کیا ایسا کسی اور سے بھی ہوا ہے؟"

مختار نے اسے چارپائی پر بٹھا لیا اور پوچھا "تم بولتی کیوں نہیں ہو شاردا؟"

شاردا کے دوپٹے کے پیچھے اس کا سینہ دھڑک رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مختار کو اس کا یہ سکوت بہت پریشان کن محسوس ہوا "بولو شاردا —— اگر تمہیں میری یہ حرکت بُری لگی ہے تو کہہ دو —— خدا کی قسم میں معافی مانگ لوں گا —— تمہاری طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا میں نے کبھی ایسی جرأت نہ کی ہوتی، لیکن جانے مجھے کیا ہو گیا ہے —— دراصل —— دراصل مجھے تم سے محبت ہے۔"

شاردا کے ہونٹ ہلے جیسے انہوں نے لفظ "محبت" ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مختار نے بڑی گرم جوشی سے کہنا شروع کیا "مجھے معلوم نہیں تم محبت کا مطلب

سمجھتی ہو کہ نہیں ــــــ میں خود اس کے متعلق زیادہ واقفیت نہیں رکھتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمہیں چاہتا ہوں ــــــ تمہاری ساری ہستی کو اپنی اس مٹھی میں لے لینا چاہتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں اپنی ساری زندگی تمہارے حوالے کر دوں گا۔ ــــــ شاردا تم بولتی کیوں نہیں ہو؟"

شاردا کی آنکھیں خواب گوں ہو گئیں۔ مختار نے پھر بولنا شروع کر دیا: "میں نے اس روز جھرنے میں سے تمہیں دیکھا ــــــ نہیں تم مجھے خود دکھائی دیں ــــــ وہ ایک ایسا نظارہ تھا جو میں تا قیامت نہیں بھول سکتا ــــــ تم شرماتی کیوں ہو ــــــ میری نگاہوں نے تمہاری خوبصورتی چرائی تو نہیں ــــــ میری آنکھوں میں صرف اس نظارے کی تصویر ہے ــــــ تم اسے زندہ کر دو تو میں تمہارے پاؤں چوم لوں گا!" یہ کہہ کر مختار نے شاردا کا ایک پاؤں چوم لیا۔

وہ کانپ گئی۔ چارپائی پر سے ایک دم اٹھ کر اس نے لرزاں آواز میں کہا: "یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ ــــــ ہمارے دھرم میں ــــــ"

مختار خوشی سے اچھل پڑا: "دھرم ورم کو چھوڑو ــــــ پریم کے دھرم میں سب ٹھیک ہے!" یہ کہہ کر اس نے شاردا کو چومنا چاہا، مگر وہ تڑپ کر ایک طرف ہٹی اور بڑے شرمیلے انداز میں مسکراتی بھاگ گئی۔ مختار نے چاہا کہ وہ اُڑ کر مٹی پر پہنچ جائے۔ وہاں سے نیچے صحن میں کود ے اور ناچنا شروع کر دے۔

مختار کی والدہ اور بہن آ گئیں تو شاردا آئی۔ مختار کو دیکھ کر اس نے فوراً نگاہیں

ینچی کرلیں۔ مختار وہاں سے کھسک گیا کہ راز افشا نہ ہو۔
دوسرے روز اوپر کوٹھے پر چڑھا۔ جھرنے میں سے جھانکا تو دیکھا کہ شاروا کھڑکی کے پاس کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ مختار نے اس کو آواز دی:
"شاروا!"
شاروا چونکی۔ کنگھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گلی میں جا گری۔ مختار ہنسا۔ شاروا کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ مختار نے اس سے کہا "ڈرپوک ہو تم ——— ہولے سے آواز دی اور تمہاری کنگھی چھوٹ گئی۔"
شاروا نے کہا: "اب لا کے دیجئے نئی کنگھی مجھے ——— یہ تو موری میں جا گری ہے۔"
مختار نے جواب دیا: "ابھی لاؤں۔"
شاروا نے فوراً کہا: "نہیں نہیں ——— میں نے تو مذاق کیا ہے۔"
"میں نے بھی مذاق کیا تھا۔ تمہیں چھوڑ کر میں کنگھی لینے جاتا؟ ——— کبھی نہیں!"
شاروا مسکرائی: "میں بال کیسے بناؤں!"
مختار نے جھرنے کے سوراخوں میں اپنی انگلیاں ڈالیں: "یہ میری انگلیاں لے لو!"
شاروا ہنسی ——— مختار کا جی چاہا کہ وہ اپنی ساری عمر اس ہنسی کی چھاؤں میں گزار دے: "شاروا، خدا کی قسم، تم ہنسی ہو۔ میرا رواں رواں شادماں ہو گیا ہے۔"

—— تم کیوں اتنی پیاری ہو؟ —— کیا دنیا میں کوئی اور لڑکی بھی تم جتنی پیاری ہوگی —— یہ کم بخت جھرنے —— یہ مٹی کے ذلیل پردے جی چاہتا ہے ان کو توڑ پھوڑ دوں۔"

شاردا پھر ہنسی۔ مختار نے کہا: "یہ ہنسی کوئی اور نہ دیکھے، کوئی اور نہ سنے —— شاردا صرف میرے سامنے ہنسنا —— اور اگر کبھی ہنسنا ہو تو مجھے بلا لیا کرو —— میں اس کے ارد گرد اپنے ہونٹوں کی دیواریں کھڑی کر دوں گا۔"

شاردا نے کہا: "آپ باتیں بڑی اچھی کرتے ہیں۔"

"تو مجھے انعام دو —— محبت کی ایک ہلکی سی نگاہ ان بھرنوں سے میری طرف پھینک دو —— میں اسے اپنی پلکوں سے اٹھا کر اپنی آنکھوں میں چھپا لوں گا۔" مختار نے شاردا کے عقب میں دور ایک سایہ سا دیکھا اور فوراً جھرنے سے ہٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو کھڑکی خالی تھی۔ شاردا جا چکی تھی۔

آہستہ آہستہ مختار اور شاردا دونوں شیر و شکر ہو گئے۔ تنہائی کا موقع ملتا تو دیر تک پیار، محبت کی باتیں کرتے رہتے —— ایک دن روپ کور اور اس کا خاوند لالہ کالو مل کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ مختار گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اس کو ایک کنکر لگا۔ اس نے اوپر دیکھا، شاردا تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔

مختار اس کے پاس پہنچ گیا۔ پورا تخلیہ تھا۔ خوب گھل مل کے باتیں ہوئیں۔ مختار

نے اس سے کہا "اس روز مجھ سے گستاخی ہوئی تھی اور میں نے معافی مانگ لی تھی،
آج پھر گستاخی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، لیکن معافی نہیں مانگوں گا!" اور اپنے ہونٹ
شاردا کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دیے۔

شاردا نے شرمیلی شرارت سے کہا "اب معافی مانگیے!"

"جی نہیں ـــــ اب یہ ہونٹ آپ کے نہیں ـــــ میرے ہیں ـــــ کیا
میں جھوٹ کہتا ہوں؟"

شاردا نے نگاہیں نیچی کر کے کہا: "یہ ہونٹ کیا، میں ہی آپ کی ہوں!"

مختار ایک دم سنجیدہ ہو گیا: "دیکھو شاردا۔ ہم اس وقت ایک آتش فشاں
پہاڑ پر کھڑے ہیں۔ تم سوچ لو، سمجھ لو ـــــ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ خدا کی قسم کھا
کر کہتا ہوں کہ تمہارے سوا میری زندگی میں اور کوئی عورت نہیں آئے گی ـــــ میں قسم
کھاتا ہوں کہ زندگی بھر میں تمہارا رہوں گا۔ میری محبت ثابت قدم رہے گی ـــــ
کیا تم بھی اس کا عہد کرتی ہو؟"

شاردا نے اپنی نگاہیں اٹھا کر مختار کی طرف دیکھا: "میرا پریم سچا ہے!"

مختار نے اس کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا اور کہا: "زندہ رہو ـــــ صرف میرے
لیے، میری محبت کے لیے وقف رہو ـــــ خدا کی قسم شاردا، اگر تمہارا التفات
مجھے نہ ملتا تو میں یقیناً خودکشی کر لیتا ـــــ تم میری آغوش میں ہو، مجھے ایسا محسوس
ہوتا ہے کہ ساری دنیا کی خوشیوں سے میری جھولی بھری ہوئی ہے۔ میں بہت

خوش نصیب ہوں"۔

شاردا نے اپنا سر مختار کے کندھے پر گرا دیا: "آپ باتیں کرنا جانتے ہیں ——— مجھ سے اپنے دل کی بات نہیں کہی جاتی"۔

دیر تک دونوں ایک دوسرے میں مدغم رہے۔ جب مختار وہاں سے گیا تو اس کی روح ایک نئی اور سہانی لذت سے معمور تھی۔ ساری رات وہ سوچتا رہا۔ دوسرے دن کلکتے چلا گیا جہاں اس کا باپ کاروبار کرتا تھا۔ آٹھ دن کے بعد واپس آیا۔ شاردا حسبِ معمول کروشیے کا کام سیکھنے مقررہ وقت پر آئی۔ اس کی نگاہوں نے اس سے کئی باتیں کیں۔ کہاں غائب رہے اتنے دن؟ ——— مجھ سے کچھ نہ کہا اور کلکتے چلے گئے؟ محبت کے بڑے دعوے کرتے تھے ——— میں نہیں بولوں گی تم سے ——— میری طرف کیا دیکھتے ہو، کیا چاہتے ہو مجھ سے؟

مختار بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تنہائی نہیں تھی۔ وہ کافی طویل گفتگو اس سے کرنا چاہتا تھا۔ دو دن گزر گئے، موقعہ نہ ملا۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں گونگی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر تیسرے روز شاردا نے اسے بلایا۔ مختار بہت خوش ہوا۔ روپ کور اور اس کا خاوند لالہ کالو مل گھر میں نہیں تھے۔

شاردا سیڑھیوں میں ملی۔ مختار نے وہیں اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگانا چاہا۔ وہ تڑپ کر اوپر چلی گئی۔ ناراض تھی۔ مختار نے اس سے کہا: "دیکھو میری جان، میرے پاس بیٹھو، میں تم سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی باتیں جن کا ہماری

زندگی سے بڑا گھر التعلق ہے۔"

شاردا اس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی: "تم بات ٹالو نہیں ـــــ بتاؤ مجھے بتلائے بغیر کلکتے کیوں گئے ـــــ سچ میں بہت روئی۔"

مختار نے بڑھ کر اس کی آنکھیں چومیں: "اس روز میں جب سے گیا تو ساری رات سوچتا رہا ـــــ جو کچھ اس روز ہوا اس کے بعد یہ سوچ بچار لازمی تھی۔ ہماری حیثیت میاں بیوی کی تھی۔ میں نے غلطی کی۔ تم نے کچھ نہ سوچا ـــــ ہم نے ایک ہی جست میں کئی منزلیں طے کرلیں اور یہ غور ہی نہ کیا کہ ہمیں جانا کس طرف ہے ـــــ سمجھ رہی ہو نا شاردا!"

شاردا نے آنکھیں جھکالیں: "جی ہاں۔"

"میں کلکتے اس لیے گیا تھا کہ ابا جی ـــ مشورہ کروں۔ تمہیں سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے ان کو راضی کرلیا ہے۔" مختار کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ شاردا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے کہا: "میرے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہوگیا ہے ـــــ میں اب تم سے شادی کرسکتا ہوں۔"

شاردا نے ہولے سے کہا: "شادی؟"

"ہاں شادی!"

شاردا نے پوچھا: "کیسے ہوسکتی ہے ہماری شادی؟"

مختار مسکرایا: "اس میں مشکل ہی کیا ہے ـــــ تم مسلمان ہوجانا!"

شاردا ایک دم چونکی: "مسلمان؟"

مختار نے بڑے اطمینان سے کہا: ہاں ہاں ـــــ اس کے علاوہ اور ہو ہی کیا سکتا ہے ـــ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے گھر والے بڑا ہنگامہ مچائیں گے۔ لیکن میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔ ہم دونوں یہاں سے غائب ہوجائیں گے۔ سیدھے کلکتے چلیں گے۔ باقی کام اباجی کے سپرد ہے۔ جس روز وہاں پہنچیں گے اسی روز مولوی بلا کر تمہیں مسلمان کر دیں گے۔ شادی بھی اسی وقت ہو جائے گی۔"

شاردا کے ہونٹ جیسے کسی نے سی دیئے۔ مختار نے اس کی طرف دیکھا "خاموش کیوں ہو گئیں؟"

شاردا نہ بولی۔ مختار کو بڑی الجھن ہوئی "بتاؤ شاردا کیا بات ہے؟"

شاردا نے بہ مشکل اتنا کہا: "تم ہندو ہو جاؤ"

"میں ہندو ہو جاؤں؟" مختار کے لہجے میں حیرت تھی۔ "وہ ہنسا: "میں ہندو کیسے ہو سکتا ہوں؟"

"میں کیسے مسلمان ہو سکتی ہوں" شاردا کی آواز مدھم تھی۔

"تم کیوں مسلمان نہیں ہو سکتیں ـــ میرا مطلب ہے کہ ـــ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اس کے علاوہ اسلام سب سے اچھا مذہب ہے ـــ ہندو مذہب بھی کوئی مذہب ہے۔ گائے کا پیشاب پیتے ہیں۔ بُت پوجتے ہیں ـــ میرا مطلب ہے کہ ٹھیک ہے اپنی جگہ یہ مذہب بھی۔ مگر اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا" مختار کے خیالات پریشان تھے: "تم مسلمان ہو جاؤ گی تو بس ـــ میرا مطلب ہے کہ سب

ٹھیک ہو جائے گا۔"
شاردا کے چہرے کا تانبے جیسا رنگ زرد پڑگیا: "آپ ہندو نہیں ہونگے؟"
مختار ہنسا: "پاگل ہو تم؟"
شاردا کا رنگ اور زرد پڑگیا: "آپ جایئے ——— وہ لوگ آنے والے ہیں"
یہ کہہ کر وہ پلنگ پر سے اٹھی۔
مختار متحیر ہو گیا: "لیکن شاردا ———"
"نہیں نہیں جایئے آپ ——— جلدی جایئے ——— وہ آجائیں گے" شاردا کے لہجے میں بے اعتنائی کی سردی تھی۔
مختار نے اپنے خشک حلق سے بہ مشکل یہ الفاظ نکالے: "ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ شاردا تم ناراض کیوں ہو گئیں؟"
"جاؤ ——— چلے جاؤ ——— ہمارا مذہب بہت بڑا ہے ——— تم مسلمان بہت اچھے ہو"۔ شاردا کے لہجے میں نفرت تھی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ مختار اپنا اسلام سینے میں دبائے وہاں سے چلا گیا۔

مجید کا ماضی

مجید کی ماہانہ آمدن ڈھائی ہزار روپے تھی۔ موٹر تھی۔ ایک عالی شان کوٹھی تھی۔ بیوی تھی۔ اس کے علاوہ دس پندرہ عورتوں سے میل جول تھا۔ مگر جب کبھی وہ وسکی کے تین چار پیگ پیتا تو اسے اپنا ماضی یاد آجاتا۔ وہ سوچتا کہ اب وہ اتنا خوش نہیں جتنا کہ پندرہ برس پہلے تھا جب اس کے پاس رہنے کو کوٹھی تھی، نہ سواری کے لیے موٹر، بیوی تھی نہ کسی عورت سے اس کی شناسائی تھی۔

ڈھائی ہزار روپے تو ایک اچھی خاصی رقم ہے۔ ان دنوں اس کی آمدن صرف ساٹھ روپے ماہوار تھی۔ ساٹھ روپے جو اسے بڑی مشکل سے ملتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ اس کی زندگی افتان و خیزاں حالات کے ہوتے ہوئے بھی ہموار تھی۔

اب اسے بے شمار تفکرات تھے۔ کوٹھی کے، بیوی کے، بچوں کے۔ اور ان عورتوں کے جن سے ان کا میل جول تھا۔ انکم ٹیکس کا ٹنٹا الگ تھا۔ سیلز ٹیکس کا جھگڑا جدا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی الجھنیں تھیں جن سے مجید کو کبھی نجات ہی نہیں ملتی تھی چنانچہ اب وہ اس زمانے کو اکثر یاد کرتا تھا جب اس کی زندگی ایسے تفکرات اور ایسی الجھنوں سے آزاد تھی۔ وہ ایک بڑی غریبی کی لیکن بڑی خوشگوار زندگی بسر کرتا تھا۔

انکم ٹیکس زیادہ لگ گیا ہے۔ ماہروں سے مشورہ کرو۔ آفیسروں سے ملو۔ ان کو رشوت دو۔ سیلز ٹیکس کا جھگڑا چکاؤ۔ بلیک مارکیٹ کرو۔ یہاں سے جو کماؤ اس کو وائٹ کرو۔ جھوٹی رسیدیں بناؤ۔ مقدموں کی تاریخیں بھگتو۔ بیوی کی فرمائشیں پوری کرو۔ بچوں کی نگہداشت کرو یوں تو مجید کام بڑی مستعدی سے کرتا تھا اور۔ وہ اپنی اس نئی ہنگامہ خیز زندگی میں رچ پچ گیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ناخوش تھا۔ یہ ناخوشی اسے کاروباری اوقات میں محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس کا احساس اس کو صرف اس وقت ہوتا تھا جب وہ فرصت کے اوقات میں آرام سے بیٹھ کر وسکی کے تین چار پیگ پیتا تھا۔ اس وقت بیتا ہوا زمانہ اس کے دل و دماغ میں ایک دم انگڑائیاں لیتا ہوا بیدار ہو جاتا اور وہ بڑا سکون محسوس کرتا لیکن جب اس بیتے ہوئے زمانے کی تصویر اس کے دل و دماغ سے محو ہو جاتی تو وہ بڑا مضطرب ہو جاتا۔ پر یہ اضطراب دیرپا نہیں ہوتا تھا کیونکہ مجید فوراً ہی

اپنی کاروباری الجھنوں میں گرفتار ہوجاتا تھا۔

مجید نے جو کچھ بنایا تھا، اپنی محنت و مشقت سے بنایا تھا۔ کوٹھی، اس کا ساز و سامان، موٹر، غرضکہ ہر چیز اس کے گاڑھے پسینے کی کمائی تھی۔ اس کو اس بات کا بہت مان تھا کہ آسائش کے جتنے سامان ہیں۔ سب اس نے خود بنائے ہیں۔ اس نے کسی سے مدد نہیں لی۔ لیکن تفکرات اب زیادہ ہوگئے تھے۔

وہ جو دس پندرہ عورتیں تھیں اس کے لیے وبالِ جان بن گئی تھیں۔ ایک سے ملو تو دوسری ناراض ہوجاتی تھیں۔ ٹیلی فون پہ ٹیلی فون آرہے ہیں۔ بیوی کا ڈر الگ، کاروبار کی فکر جدا۔ عجب جھنجھٹ تھا۔ مگر وہ دن بھی تھے جب مجید کو صرف دو روپے روزانہ ملتے تھے، ساٹھ روپے ماہوار جو اسے بڑی مشکل سے ملتے تھے مگر دن عجیب انداز میں گزرتے تھے بڑے دلچسپ تھے وہ دن۔ بڑی دلچسپ تھیں وہ راتیں جو لکڑی کے ایک بنچ پر گزرتی تھیں جس میں ہزارہا کھٹمل تھے، خدا معلوم کتنے عمر رسیدہ کیونکہ وہ بنچ بہت پرانی تھی۔ اس کے مالک نے دس برس پہلے اس کو ایک دکان والے سے لیا تھا جو اپنا کاروبار سمیٹ رہا تھا۔ اس دکاندار نے گیارہ برس پہلے اس کا سودا ایک کباڑی سے کیا تھا۔

مجید کو جو مزا جو لطف اس کھٹملوں سے بھری ہوئی بنچ پر سونے میں آتا تھا اب اسے اپنے پرتکلف سپرنگوں والے پلنگ پر سونے میں نہیں آتا تھا۔ اب اسے ہزاروں کی فکر ہوتی تھی، اس وقت صرف دو روپے روزانہ کی مار ولنوں

خالی بوتلیں خالی ڈبے

اس کے پاس کینوس کے دو لوٹ تھے۔ اب سینکڑوں تھے۔ مگر وہ بات نہیں تھی۔ ہر روز دن کے کام سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے دفتر کی بنچ پر سونے لگتا تو لوٹ اتار کر اس پر بنیکو ملتا۔ صبح اٹھ کر حمام میں اکنی دے کر نہاتا۔ شیو کرتا۔ سامنے ہوٹل میں باہر والے سے کہتا کہ اس کا ناشتہ لے آئے۔ ایک مکھن لگا براؤن۔ ایک پیالی چا۔ لطف آجاتا۔ ناشتہ کر کے وہ پاسنگ شو کا سگریٹ پیتا۔ ایک پان کھاتا اور کام شروع کر دیتا۔

دوپہر کا کھانا وہ بھنڈی بازار میں حاجی کے ہوٹل میں کھاتا۔ یہ ہوٹل کتنا اچھا تھا۔ کھڑی دال گھی میں بگھاری ہوئی کتنی مزیدار ہوتی تھی۔ کھارا گوشت تو بے حد لذیذ ہوتا تھا۔ پھر برف کا ٹھنڈا پانی۔ پاسنگ شو کا ایک سگریٹ۔ اس کا سارا وجود شاش بشاش ہو جاتا تھا۔

کھانے کے بعد تھوڑا سا آرام کیا، پھر کام شروع کر دیا۔ شام کو چھ بجے فارغ ہو کر ایک آنہ ٹریم پر خرچا اور سیدھے اپالو بندر پہونچ گئے۔ ٹھنڈی ہوا۔ بھانت بھانت کے آدمی۔ بھانت بھانت کی بولیاں۔ بڑی بڑی عالی شان عمارتیں۔ وسیع و عریض سمندر۔ اونچی اونچی لہریں۔ کشتیاں۔ موٹریں۔ سائیکلیں۔ خوبصورت عورتیں، گجراتی عورتیں، مرہٹی عورتیں جو اپنی چمکیلے جوڑوں پر پھولوں کی وینی لگاتی تھیں، پارسی عورتیں، تیکھی تیکھی ناک والی۔ اینگلو انڈین اور یورپین عورتیں۔ یہ سب اس کے پاس سے گزرتیں۔ وہ ان کو دیکھتا تو اس کے دل و دماغ کو فرحت پہنچتی۔ اس کو کبھی یہ

خواہش نہ ہوتی کہ ان میں کوئی اس کی ہو جائے لیکن اب بیوی کے علاوہ دس پندرہ عورتوں سے اس کا جنسی میل جول تھا اب وہ ہر خوبصورت عورت کو شہوانی نظروں سے دیکھتا تھا تو کبھیں سوچتا کہ کس طرح ان کو حاصل کیا جائے۔

اب بھی وہ سیر کرتا تھا، باغوں میں گھومتا تھا مگر پھول اتنے خوبصورت دکھائی نہیں دیتے جتنے کہ اس زمانے میں دکھائی دیتے تھے۔ اب سینکڑوں پھول اس کے گلدانوں میں پڑے رہتے تھے جو مرجھا جانے پر پھینک دیے جاتے تھے، اس کی نگاہ ان پر پڑتی ہی نہیں تھی۔ پڑتی بھی ہوگی تو وہ ان میں کوئی کشش محسوس نہیں کرتا تھا۔

ایک دن اپولو بندر گئے، دوسرے دن چوپاٹی چلے گئے۔ دہی بڑے اور چاٹ کھائی۔ گیلی ریت پر بیٹھے سمندر کا نظارہ کرتے رہتے۔ دور حد نگاہ تک پھیلا سمندر۔ دھوپ میں چاندنی کی طرح چمکتی ہوئی لہریں۔ کشتیوں کے سفید سفید بادبان۔ یہاں سے جی اکتایا تو مالابار ہل چلے گئے ہینگنگ گارڈنز کیا فرحت بخش مقام تھا۔

اس زمانے میں اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ اس کو ساری دنیا دوست نظر آتی تھی۔ ٹریم اس کی دوست تھی۔ کھلا آسمان اس کا دوست تھا۔ سڑکیں اور فٹ پاتھ اس کے دوست تھے کھٹملوں سے بھری ہوئی بنچ پر سونے سے پہلے وہ فٹ پاتھوں پر سیر کرتا تھا ـــــ ہر چیز اس کو اپنی محسوس ہوتی تھی مگر اب اپنے

بھی پرائے لگتے تھے۔ سینکڑوں حریف تھے۔ کاروبار میں، عشق بازیوں میں، ہر جگہ، ہر مقام پر اس کا کوئی نہ کوئی حریف موجود ہوتا تھا۔

وہ زندگی عجیب و غریب تھی۔ یہ زندگی بھی عجیب و غریب تھی مگر دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ تفکر سے آزاد تھی، یہ تفکر سے پُر۔ چھوٹی سے چھوٹی خوشی اس کے دل و دماغ میں ایک عرصے تک موجود رہتی۔ ایک عرصے تک اس کو شاداں و فرحاں رکھتی۔ چھ آنے دے کر ایک میل ٹیکسی میں بیٹھے تو یہ ایک بہت بڑی عیاشی تھی۔ بھکاری کو ایک پیسہ دیا تو بڑی روحانی مسرت محسوس کی۔ اب وہ سینکڑوں کی خیرات کرتا تھا اور کوئی روحانی مسرت محسوس نہیں کرتا تھا اس لیے کہ یہ محض نمائش کی خاطر ہوتی تھی۔

اس زمانے میں اس کی عیاشیاں بڑی چھوٹی چھوٹی مگر بڑی دل چسپ ہوتی تھیں۔ خود کو خوش کرنے کے لیے وہ بڑے نرالے طریقے ایجاد کر لیتا تھا۔

الیکٹرک ٹرین میں بیٹھے اور کسی گاؤں میں جا کر تاڑی پینے لگے۔

پتنگ لیا اور چوپاٹی پر بچوں کے ساتھ اڑانے لگے۔

دادر اسٹیشن پر صبح سویرے چلے گئے اور اسکول جانے والی لڑکیاں تاڑتے رہے ـــ پل کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ اینگلو انڈین لڑکیاں اسکرٹ پہنے اوپر چڑھتیں تو ان کی ننگی ٹانگیں نظر آتیں۔ اس نظارے سے اس کو بڑی طفلانہ سی مسرّت محسوس ہوتی۔

مجید کا ماضی

کبھی کبھی طویل فاصلے پیدل طے کرتا۔ گھر پہونچتا تو اسے خوشی ہوتی کہ اس نے اکنّی یا دوئی بچالی ہے۔ یہ اکنّی یا دوئی وہ کسی ایسی چیز پر خرچ کرتا جو اس کے روزانہ پروگرام میں نہیں ہوتی تھی۔

کسی لڑکی کو محبت بھرا خط لکھا اور جو پتا دماغ میں آیا لکھ کر پوسٹ کر دیا اور اس حماقت پر دل ہی دل میں خوب ہنسے۔

ایک انگلی کا ناخن بڑھا لیا اور کسی دکان سے ٹسٹ کرنے کے بہانے اس پر کیوٹکس لگالیا۔

ایک دن صرف دوسروں سے مانگ مانگ کے سگریٹ پئے اور بے حد شرارت بھری خوشی محسوس کی۔

دفتر میں بنچ کے کھٹملوں نے زیادہ تنگ کیا تو ساری رات بازاروں میں گھومتے رہے اور بجائے کوفت کے راحت محسوس کی۔

جیب میں پیسے کم ہوتے تو دوپہر کا کھانا گول کر دیا اور یہ محسوس کیا کہ وہ کھا چکا ہے۔

اب یہ باتیں نہیں تھیں۔ دفتر سے اس نے روپے کمانے کے ڈھنگ سیکھے۔ دولت آنے لگی تو یہ سب باتیں آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔ اس کی یہ ننھی ننھی مسرتیں سب سونے اور چاندی کے نیچے دب گئیں۔

اب رقص و سرود کی محفلیں جمتی تھیں مگر ان سے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا

تھا جو پل کے نیچے کھڑے ہو کر ایک خاص زاویے سے ننگی تحرک ٹانگیں دیکھنے میں محسوس ہوتا تھا۔ اس کی راتیں پہلے بالکل تنہا گزرتی تھیں۔ اب کوئی نہ کوئی عورت اس کے آغوش میں ہوتی مگر وہ سکون غائب تھا، وہ کنوارا سکون جس میں وہ رات بھر ملفوف رہتا تھا۔ اب اسے یہ فکر دامن گیر ہوتی تھی کہ کہیں اس کی بیوی کو پتہ نہ چل جائے۔ کہیں یہ عورت حاملہ نہ ہو جائے۔ کہیں اس کو بیماری نہ لگ جائے کہیں اس عورت کا خاوند نہ آن دھمکے۔ پہلے ایسے تفکرات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اب اس کے پاس ہر قسم کی شراب موجود رہتی تھی، مگر وہ مزا، وہ سرور جو اسے پہلے ہر روز شام کو جاپان کی بنی ہوئی "اب ہی بیئر" پینے میں آتا تھا بالکل غائب ہی ہو گیا تھا۔

اس کا معمول تھا کہ دفتر سے فارغ ہو کر چوپاٹی یا اپولو بندر کی سیر کی خوب گھومے پھرے۔ نظاروں کا مزا لیا۔ آٹھ بجے تو گھر کا رخ کیا۔ کسی نل سے منہ دھویا اور بائی کھلہ پل کے پاس والی بار میں داخل ہو گئے۔ پارسی سیٹھ کو جو بہت ہی موٹا اور اس کی ناک بڑی بے ہنگم تھی صاحب جی کہا: "کم سیٹھ سوں حال چھے؟"

اس کو بس صرف اتنی گجراتی آتی تھی، مگر جب وہ کہتا تو اسے بڑی خوشی ہوتی کہ وہ اتنے الفاظ بول سکتا ہے۔ سیٹھ مسکراتا اور کہتا "سارو چھے، سارو چھے۔"

پھر وہ پارسی سیٹھ کے کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر جنگ کی باتیں چھیڑ دیتا۔ تھوڑی

دیر کے بعد یہاں سے ہٹ کر وہ کونے والی میز کے پاس بیٹھ جاتا۔ یہ اس کی محبوب میز تھی۔ اس کے اوپر کا حصہ سنگِ مرمر کا تھا۔ بیرا اسے گیلے کپڑے سے صاف کرتا اور مجید سے کہتا "بولو سیٹھ"!

یہ سن کر مجید خود کو واقعی سیٹھ سمجھتا۔ اس وقت اس کی جیب میں ایک روپیہ چار آنے ہوتے۔ وہ بیرے کی طرف دیکھ کر بڑی شان سے مسکراتا اور کہتا "ہر روز تم مجھ سے پوچھتے ہو، سب جانتے ہو ــــــ لے آؤ جو پیا کرتا ہوں"!

بیرا اپنی عادت کے مطابق جانے سے پہلے گیلے کپڑے سے میز صاف کرتا، پونچھ کر ایک گلاس رکھتا۔ ایک پلیٹ میں کابلی چنے، دوسری میں کھاری سینگ یعنی نمک لگی مونگ پھلی لاتا۔ مجید اس سے کہتا "یار پڑلاتا تم ہمیشہ بھول جاتے ہو"!

یہ چیزیں گزک کے طور پر بیئر کے ساتھ مفت ملتی تھیں۔ مجید نے یہ طریقہ ایجاد کیا تھا کہ بیرے سے کابلی چنوں کی ایک اور پلیٹ منگوا لیتا تھا۔ چنے کافی بڑے بڑے ہوتے تھے۔ نمک اور کالی مرچ سے بہت مزیدار بن جاتے تھے۔ مونگ پھلی کی پلیٹ ہوتی تھی۔ یہ سب مل ملا کر مجید کا رات کا کھانا بن جاتے تھے۔

بیئر آتی تو وہ بڑے پرسکون انداز میں اس کو گلاس میں انڈیلتا۔ آہستہ آہستہ وہ گھونٹ بھرتا۔ ٹھنڈی یخ بیئر اس کے حلق سے اترتی تو ایک بڑی عجیب فرحت اس کو محسوس ہوتی۔ اس کو ایسا لگتا کہ ساری دنیا کی ٹھنڈک اس کے دل و دماغ میں جمع ہو گئی ہے ــــــ وہ موٹے پارسی کی طرف دیکھتا اور سوچتا، یہ پارسیوں کی

ناک کیوں اتنی موٹی ہوتی ہے۔ اس قوم نے کیا قصور کیا ہے کہ خدا ان کی ناکوں سے بالکل غافل ہے ـــــ پرسوں ٹریم میں جو پارسن بیٹھی تھی، بڑا سڈول بدن، خوبصورت آنکھیں، ابھرا ہوا سینہ، بے داغ سفید رنگ، ماتھا کشادہ، پتلے پتلے ہونٹ، لیکن یہ بڑی طوطے ایسی ناک۔ اس کو دیکھ کر مجید کو بہت ترس آیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ آیا ایسی کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ اس کی ناک ٹھیک ہو جائے ـــــ پھر اس کے دماغ میں مختلف اوقات پر دیکھی ہوئی خوبصورت اور جوان لڑکیاں تیرنے لگتی تھیں۔

اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ ان کا شباب بیئر میں گھول کر پی رہا ہے۔

دیر تک وہاں بیٹھا وہ اپنی زندگی کے حسین لمحات دہراتا رہا۔

پندرہ دن ہوئے اپولو بندر پر جب تیز ہوا میں ایک یہودن لڑکی کا ریشمی اسکرٹ اٹھا تھا تو کتنی متناسب اور حسین ٹانگوں کی جھلک دکھائی دی تھی۔

پچھلے اتوار ایرانی کے ہوٹل میں پائے کا شوربہ کتنا لذیذ تھا کیسے چٹخارے لے لے کر اس نے اس میں گرم گرم نان بھگو کر کھایا تھا۔

رنگین فلم کتنا اچھا تھا۔ رقص کتنا دلفریب تھا ان عورتوں کا۔

آج صبح ناشتے کے بعد سگریٹ پی کر لطف آگیا۔ ایسا لطف ہر روز آیا کرے تو مزے آجائیں۔

وہ میاں بیوی جو اس نے دادر اسٹیشن پر دیکھے تھے آپس میں کتنے خوش تھے۔ کبوتر اور کبوتری کی طرح گٹک رہے تھے۔

کیلی مستری بڑا اچھا آدمی ہے۔ کل میں نے اسپرو مانگی تو اس نے مفت دیدی۔ کہنے لگا: اس کے دام کیا لوں گا آپ سے۔" پچھلے ماہ اس نے وقت پر میری مدد بھی کی تھی۔ پانچ روپے ادھار مانگے، فوراً دے دیئے اور کبھی تقاضا نہ کیا۔

ٹرام میں جب اس نے اس روز مرہٹی لڑکی کو اپنی سیٹ دی تو اس نے کتنی پیار کی شکرگزاری سے کہا تھا "تھینک یو۔"

پھر وہ موٹے پارسی کی طرف دیکھتا۔ اس کے چہرے پر یہ بڑی ناک اس کو نظر آتی۔ مجید پھر سوچتا "یہ کیا بات ہے۔ ان پارسیوں کی ناکوں کے ساتھ اتنا برا سلوک کیوں کیا گیا ہے —— کتنی کوفت ہو رہی ہے اس ناک سے۔" فوراً ہی اسے خیال آتا کہ یہ پارسی بڑا نیک آدمی ہے کیونکہ وہ اس کو ادھار دے دیتا تھا۔ جب اس کی جیب میں پیسے نہ ہوتے تو وہ کاؤنٹر کے پاس جاتا اور اس سے کہتا "سیٹھ آج مال پانی نہیں —— کل۔"

سیٹھ مسکراتا "کوئی واندہ نہیں" یعنی کوئی حرج نہیں، پھر آجائیں گے۔

بیئر کی بوتل چودہ آنے میں آتی تھی۔ اس کو خالی کر کے اور پلیٹیں صاف کر کے وہ ہاتھ کے بڑے خوبصورت اشارے سے بیرے کو بل لانے کے لیے کہتا۔ بیرا بل لاتا تو وہ اسے ایک روپیہ دیتا اور بڑی شان سے کہتا "باقی دو آنے تم اپنے پاس رکھو۔"

بیرا سلام کرتا۔ مجید بے حد مسرور اور شاداں اٹھتا اور پارسی سیٹھ کو "صاحب جی"

کمرہ کر گھر کی طرف روانہ ہوتا۔ وہاں پہونچتے ہی اس کے قدم رک جاتے پڑوس کی گلی میں ایک چھوٹی سی تاریک کھولی میں مس لینا رہتی تھی۔ کسی زمانے میں بڑی مشہور ڈانسر تھی۔ مگر اب بوڑھی ہوچکی تھی۔ یہودن تھی۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں۔ الیسٹر اور سیلن۔ الیسٹر سولہ برس کی تھی اور سیلن تیرہ برس کی۔ دونوں رات کو اپنی ماں کے پاس ایک لمبا کرتہ پہنے لیٹی ہوتی تھیں۔ صرف ایک پلنگ تھا۔ مس لینا فرش پر چٹائی بچھا کر سوتی تھیں۔

رات کو بیئر پی کر مس لینا کے پاس جانا مجید کا معمول بن گیا تھا۔ وہ باہر ہوٹل والے کو تین چائے کا آرڈر دے کر گلی میں داخل ہوتا اور مس لینا کی کھولی میں پہنچ جاتا۔ اندر ٹین کی کپی جل رہی ہوتی۔ الیسٹر اور سیلن قریب قریب نیم برہنہ ہوتیں۔ مجید پہونچتا تو زور سے پکارتا: "السلام علیکم"

ماں بیٹیاں ٹھیٹ عربی لہجے میں وعلیکم السلام کہتیں اور وہ لوہے کی کرسی پر بیٹھ جاتا اور مس لینا سے کہتا "چائے کا آرڈر دے آیا ہوں"

الیسٹر باریک آواز میں کہتی "تھینک یو" چھوٹی بستر پر لوٹیں لگانا شروع کر دیتی مجید کو اس کی آڑی ترچھی چھاتیوں اور ننگی ٹانگوں کی کئی جھلکیاں دکھائی دیتیں جو اس کے مسرور و مخمور دماغ کو بڑی فرحت بخشتیں۔

باہر والا چائے کر آتا تو ماں بیٹیاں پینا شروع کر دیتیں۔ مجید خاموش بیٹھا رہتا اور اس تنگ و تار ماحول میں ایک عجیب و غریب سکون اس کو محسوس ہوتا وہ چاہتا کہ ان تینوں کا شکریہ ادا کرے۔ اس دھواں دینے والی کپی کا بھی شکریہ ادا کرے جو

مجید کا ماضی

دھیمی دھیمی روشنی پھیلا رہی تھی۔ وہ لوسے کی اس کرسی کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا جس نے اس کو نشست پیش کی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر وہ ماں بیٹیوں کے پاس بیٹھا۔ دونوں لڑکیاں خوبصورت تھیں۔ ان کی خوبصورتی مجید کی آنکھوں میں بڑی پیاری نیند لے آئی۔ رخصت لے کر وہ اٹھتا اور جھومتا جھومتا اپنے دفتر میں پہنچ جاتا اور کپڑے بدل کر بنچ پر لیٹتا اور لیٹتے ہی خوشگوار اور پرسکون نیند کی گہرائیوں میں اتر جاتا۔

فرحت کے اوقات میں وسکی کے تین چار پیگ پی کر جب مجید اس زمانے کو یاد کرتا تو کچھ عرصے کے لیے سب کچھ بھول کر اس میں محو ہو جاتا۔ نشہ کم ہوتا تو وہ بلیک مارکیٹ کے متعلق سوچنے لگتا۔ روپیہ کمانے کے نئے ڈھنگ تخلیق کرتا۔ ان عورتوں کے متعلق غور کرتا جن سے وہ جنسی رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا۔

مجید کا ماضی جنگ سے پہلے کی فضا میں گم ہو چکا تھا ـــــ ایک مدھم لکیر سی رہ گئی تھی جس کو مجید اب دولت سے پیٹ رہا تھا۔

حامد کا بچّہ

لاہور سے بالو ہر گوپال آئے تو حامد گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ انہوں نے آتے ہی حامد سے کہا: "لو بھئی فوراً ایک ٹیکسی کا بندوبست کرو"

حامد نے کہا: "آپ ذرا تو آرام کر لیجئے۔ اتنا لمبا سفر طے کر کے یہاں آئے ہیں، تھکاوٹ ہو گی!"

بالو ہر گوپال اپنی دُھن کے پکے تھے۔ "نہیں بھائی، مجھے تھکاوٹ واوٹ کچھ نہیں۔ میں یہاں سیر کی غرض سے آیا ہوں۔ آرام کرنے نہیں آیا۔ بڑی مشکل سے دس دن نکالے ہیں۔ یہ دس دن تم میرے ہو۔ جو میں کہوں گا تمہیں ماننا ہو گا۔ میں اب کے عیاشی کی انتہا کر دینا چاہتا ہوں ——— سوڈا منگواؤ!"

حامد نے بہت منع کیا کہ دیکھئے بالو ہر گوپال صبح سویرے مت شروع کیجئے۔ مگر

وہ نہ مانے۔ بکس کھول کر جونی واکر کی بوتل نکالی اور اسے کھولنا شروع کر دیا "سوڈا نہیں منگواتے تو لاؤ تھوڑا سا پانی لاؤ ——— کیا پانی بھی نہیں دو گے"؟

بابو ہرگوپال حامد سے عمر میں بڑے تھے۔ حامد تیس کا تھا تو وہ چالیس کے تھے۔ حامد ان کی عزت کرتا تھا اس لیے کہ اس کے مرحوم باپ سے بابو صاحب کے مراسم تھے۔ اس نے فوراً سوڈا منگوایا اور بڑی لجاجت سے کہا: "دیکھیے مجھے مجبور نہ کیجیے گا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میری بیوی بڑی سخت گیر ہے۔" مگر بابو ہرگوپال کے سامنے اس کی کوئی پیش نہ چلی اور اسے ساتھ دینا ہی پڑا۔

جیسی کہ امید تھی، چار پیگ پینے کے بعد بابو ہرگوپال نے حامد سے کہا: "لو بھئی اب چلیں گھومنے۔ مگر دیکھو کوئی ایسی ٹیکسی پکڑنا جو فنڈاشاندار ہو۔ پرائیویٹ ٹیکسی ہو تو بہت اچھا ہے۔ مجھے ان میٹروں سے نفرت ہے۔"

حامد نے پرائیویٹ ٹیکسی کا بندوبست کر دیا۔ نئی فورڈ تھی۔ ڈرائیور بھی بہت اچھا تھا ——— بابو ہرگوپال بہت خوش ہوئے ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنا چوڑا ہوا اٹلا کھول کر دیکھا۔ سو سو کے کئی نوٹ تھے اور اطمینان کا سانس لیا اور اپنے آپ سے کہا: "کافی ہیں ——— لو بھئی ڈرائیور اب چلو!"

ڈرائیور نے اپنے سر پر ٹوپی کو ترچھا کیا اور پوچھا "کہاں سیٹھ"؟

بابو ہرگوپال حامد سے مخاطب ہوئے: "بولو بھئی تم"؟

حامد نے کچھ دیر سوچ کر ایک ٹھکانا بتایا ٹیکسی نے ادھر کا رخ کیا۔ تھوڑی ہی دیر

کے بعد بمبئی کا سب سے بڑا دلّال ان کے ساتھ تھا۔ اس نے مختلف مقامات سے مختلف لڑکیاں نکال نکال کر پیش کیں مگر حامد کو کوئی پسند نہ آئی وہ نفاست پسند تھا، صفائی کا شدید احساس۔ یہ لڑکیاں سُرخی پاؤڈر کے باوجود اس کو گندی دکھائی دیں۔ اس کے علاوہ ان کے چہروں پر کسبیت کی مہر تھی۔ یہ اسے بہت گھناؤنی معلوم ہوتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ عورت کو کسبی ہونے پر بھی عورت ہی رہنا چاہیے۔ اپنے عورت پن کو اپنے پیشے کے نیچے دبا نہیں دینا چاہیے۔ اس کے برعکس بالو بر گوپال غلاظت پسند تھا۔ لاکھوں میں کھیلتا تھا چاہتا تو بمبئی کا پورا شہر صابن پانی سے دھلوا دیتا مگر اپنی ذاتی صفائی کا اسے کچھ خیال نہیں تھا۔ نہاتا تھا تو بہت ہی تھوڑے پانی سے۔ کئی کئی دن شیو نہیں کرتا تھا۔ گو اس چاہے میلا چکٹ ہو، اٹھا کر اس میں فرسٹ کلاس وسکی انڈیل دیتا تھا۔ غلیظ بھکارن کو سینے کے ساتھ چمٹا کر سوجاتا تھا اور کہتا تھا۔ لطف آگیا —— کیا چیز تھی!"

حامد کو حیرت ہوتی تھی کہ یہ بالو کس قسم کا انسان ہے۔ اوپر نہایت ہی قیمتی شیروانی ہے نیچے ایسی بنیان ہے کہ اس کو دیکھنے سے ابکائیاں آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ رومال پاس ہے لیکن کُرتے کے دامن سے ناک کا بہتا ہوا رینٹھ صاف کر رہا ہے غلیظ پلیٹ میں چاٹ کھا کر خوش ہو رہا ہے۔ تکیے کے غلاف میلے ہو کر بدبو چھوڑ رہے ہیں مگر اسے ان کو بدلوانے کا خیال تک نہیں آتا —— حامد نے اس کے متعلق بہت غور کیا تھا مگر کسی نتیجے پر نہ پہونچا۔ اس نے کئی مرتبہ بالو ہر گوپال سے کہا: "بالو جی آپکو غلاظت سے گھن کیوں نہیں آتی؟"

یہ سن کر بابو ہرگوپال مسکرا دیتے: "کیوں نہیں آتی —— لیکن تمہیں تو ہر جگہ غلاظت ہی غلاظت نظر آتی ہے۔ اب اس کا کیا علاج ہے؟"

حامد خاموش ہو جاتا اور دل ہی دل میں بابو ہرگوپال کی غلاظت پسندی پر کڑھتا رہتا۔

ٹیکسی دیر تک ادھر ادھر آوارہ گھومتی رہی۔ دلال نے جب دیکھا کہ حامد انتخاب کے معاملے میں بہت کڑا ہے تو اس نے دل میں کچھ سوچا اور ڈرائیور سے کہا: "شواجی پارک کی طرف دباؤ —— وہ بھی پسند نہ آئی تو قسم خدا کی بھڑواگیری چھوڑ دوں گا۔"

ٹیکسی شواجی پارک کی ایک بنگلہ نما بلڈنگ کے پاس رکی۔ دلال اوپر چلا گیا تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا اور بابو ہرگوپال اور حامد کو اپنے ساتھ لے گیا۔

بڑا صاف ستھرا کمرہ تھا۔ فرش کی ٹائلیں چمک رہی تھیں۔ فرنیچر پر گرد کا ذرہ تک نہیں تھا۔ ادھر دیوار پر سوامی وویکانند کی تصویر لٹک رہی تھی، سامنے گاندھی جی کی تصویر، سبھاش بابو کا فوٹو بھی تھا۔ میز پر مرہٹی کی کتابیں پڑی تھیں۔

دلال نے ان کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ دونوں صوفے پر بیٹھ گئے۔ حامد گھر کی صفائی سے بہت متاثر ہوا۔ چیزیں مختصر تھیں مگر قرینے سے رکھی گئی تھیں۔ فضا بڑی سنجیدہ تھی۔ اس میں کسبیوں کا وہ بے شرم تیکھا پن نہیں تھا۔

حامد بڑی بے صبری سے لڑکی کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ دوسرے کمرے سے ایک مرد نمودار ہوا۔ اس نے ہولے ہولے سرگوشیوں میں دلال سے باتیں کیں۔ بابو ہرگوپال

اور اس کے بعد حامد کی طرف دیکھا اور کہا: "ابھی آتی ہے ———— نہا رہی تھی،
کپڑے پہن رہی ہے۔"
یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

حامد نے غور سے کمرے کی چیزیں دیکھنا شروع کیں۔ میز کے پاس کونے میں بڑی خوبصورت رنگین چٹائی پڑی تھی۔ میز پر کتابوں کے ساتھ دس پندرہ رسالے تھے۔ نیچے بڑے نازک چپل چمکیلے فرش پر پڑے تھے کچھ اس انداز سے کہ ابھی ابھی ان سے پاؤں نکل گئے ہیں۔ سامنے شیشوں والی الماری میں قطار در قطار کتابیں تھیں۔

بالو ہرگوپال نے فرش پر جب اپنے سگریٹ کا آخری حصّہ اپنی گرگابی کے نیچے دبایا تو حامد کو بہت غصّہ آیا۔ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دے کہ دوسرے کمرے کے دروازے سے اس کے کانوں میں ریشمیں سرسراہٹ پہونچی۔ اس نے زاویہ بدل کر دیکھا۔ ایک گوری چِٹّی لڑکی، بالکل نئے کاشٹے میں ملبوس ننگے پیر آرہی تھی . . . . کاشٹے کا پلّو اس کے سر سے کھسکا۔ سیدھی مانگ تھی جب قریب آکر اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا تو اس کے چمکیلے جوڑے میں حامد نے ایک پتّا اڑسا ہوا دیکھا، پتّے کا رنگ سفیدی مائل تھا۔ مسلے جوڑنے میں جو بڑی صفائی سے کیا گیا تھا یہ پتّا بہت خوبصورت دکھائی دیتا تھا۔ حامد نے پرنام کا جواب اٹھ کر دیا۔ لڑکی شرماتی لجاتی ان کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔

اس کی عمر حامد کے اندازے کے مطابق سترہ برس سے اوپر نہیں تھی قد میانہ، رنگ گورا جس میں ہلکی ہلکی پیازی جھلک تھی جس طرح اس کی ساڑھی نئی تھی اسی طرح وہ خود نئی معلوم ہوتی تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جھکالیں حامد کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ آہستہ آہستہ اس کے وجود میں سرایت کررہی ہے۔ لڑکی بڑی صاف ستھری، بڑی اجلی تھی۔

بابو ہرگوپال نے حامد سے کچھ کہا تو وہ چونک پڑا جیسے اس کو کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہے: "کیا کہا بابو ہرگوپال؟"

بابو ہرگوپال نے کہا: "بات کرو بھئی۔" پھر آواز دھیمی کردی، "مجھے تو کوئی خاص پسند نہیں۔"

حامد کباب ہوگیا۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ڈھلا ہوا شباب اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ نکھری ہوئی بے داغ جوانی ریشم میں لپٹی ہوئی اس کی نظروں کے سامنے تھی جس کو وہ حاصل کر سکتا تھا۔ ایک رات کے لیے نہیں، کئی راتوں کے لیے، کیونکہ وہ قیمت ادا کرکے اپنائی جاسکتی تھی۔ لیکن حامد نے جب یہ سوچا تو اسے دکھ ہوا کہ ایسا کیوں ہے۔ یہ لڑکی بکاؤ مال ہرگز نہیں ہونی چاہیے تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اگر ایسا ہوتا تو اس کو حاصل کیسے کرتا۔

بابو ہرگوپال نے بڑے بھونڈے انداز میں پوچھا "کیا خیال ہے بھئی"

"خیال؟ حامد پھر چونکا: "آپ کو تو پسند نہیں، لیکن میں ......" وہ کچھ

کہتے کہتے رُک گیا۔

بالو ہرگوپال بڑے دوست نواز تھے۔ اٹھے اور دلّال سے کاروباری انداز میں پوچھا: "کیوں بھئی کیا دینا پڑے گا؟"

دلّال نے جواب دیا: "چھو کر ہی دیکھ لیجیے۔ ابھی تازہ تازہ دھندا شروع کیا ہے۔"

بالو ہرگوپال نے اس کی بات کاٹی: "تم اسے چھوڑو۔ معاملے کی بات کرو۔"

دلّال نے بڑی سلگائی، "سو روپے ہوں گے: پورا دن رکھیے یا پوری رات رکھیے۔ ایک دھیلا کم نہیں ہوگا۔"

بالو ہرگوپال حامد سے مخاطب ہوئے: "کیوں بھئی؟"

حامد کو بالو ہرگوپال اور دلّال کی گفتگو ناگوار گزر رہی تھی۔ اس کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس لڑکی کی توہین ہو رہی ہے —— سو روپے میں یہ دھڑکتا ہوا شباب، یہ دہکتی ہوئی جوانی —— اس کو یہ سن کر بہت کوفت ہوئی کہ سراپا حسن کا جو یہ نادر نمونہ اس کے سامنے سانس لے رہا تھا اس کی قیمت صرف سو روپے ہے —— مگر اس کوفت کے ساتھ ہی اس خیال نے اس کے دل میں چٹکی لی کہ سو روپے دے کر آدمی اس کو حاصل تو کر سکتا ہے، ایک دن یا ایک رات کے لیے لیکن پھر اس نے سوچا، صرف ایک دن یا ایک رات کے لیے —— اس کے ساتھ تو آدمی کو اپنی ساری عمر بتا دینی چاہیے —— اس کی ہستی میں اپنی مدغم کر دینی چاہیے۔"

بابو ہر گوپال نے پوچھا: "کیوں بھئی کیا خیال ہے؟"

حامد اپنا خیال ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بابو ہر گوپال مسکرایا۔ جیب سے بٹوہ نکالا اور سو روپے کا ایک نوٹ دلال کو دے دیا: "ایک ڈیڑھیا کم نہ ایک ڈیڑھیا زیادہ۔" پھر وہ حامد سے مخاطب ہوا: "چلو بھئی ــــ معاملہ طے ہو گیا!"

حامد خاموش ہو گیا۔ دونوں نیچے اتر کر ٹیکسی میں بیٹھے دلال لڑکی لے کر آ گیا۔ وہ شرماتی لجاتی ان کے ساتھ بیٹھ گئی ــــ ہوٹل میں ایک کمرے کا بندوبست کر کے بابو ہر گوپال اپنے لیے کوئی لڑکی تلاش کرنے چلا گیا۔

لڑکی پلنگ پر آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی۔ حامد کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ بابو ہر گوپال وسکی کی بوتل چھوڑ گیا تھا۔ آدھی کے قریب باقی تھی۔ حامد نے سوڈا منگوا کر ایک بہت بڑا پیگ لگایا۔ اس سے اس میں کچھ جرأت پیدا ہوئی۔ اس نے لڑکی کے پاس بیٹھ کر پوچھا: "آپ کا نام؟"

لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر جواب دیا: "لتا منگلاؤں کر۔"

بڑی پیاری آواز تھی۔ حامد نے ایک بڑا پیگ اپنے اندر انڈیلا اور لتا کے سر سے کاشٹے کا پلو ہٹا کر اس کے چمکیلے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ لتا نے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جھپکائیں۔ حامد نے ساڑھی کا پلو بالکل نیچے گرا دیا۔ چست چولی کے کھلے گریبان سے اس کو لتا کے سینے کے ابھار کی ننھی سی جھلک دکھائی دی۔ حامد کا سارا وجود تھرا گیا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ چولی بن کر لتا کے ساتھ چمٹ جائے۔ اس

کی میٹھی میٹھی گرمی محسوس کرے اور سو جائے۔

لتا ہندوستانی نہیں جانتی تھی۔ اس کو منگلاؤں سے آئے ہوئے صرف دو مہینے ہوئے تھے۔ مرہٹی بولتی تھی۔ بڑی کرخت زبان ہے لیکن اس کے منہ میں یہ بڑی ملائم ہو گئی تھی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں حامد کی باتوں کا جواب دیتی تو وہ اس سے کہتا "نہیں لتا، تم مرہٹی میں بات کرو مجھے بہت اچھی لگتی ہے"

لفظ "اچھا لگتی" سن کر لتا ہنس پڑتی اور صحیح تلفظ اس کو بتاتی، لیکن حامد چ اور ے کی درمیانی آواز پیدا نہ کر سکتا۔ اس پر دونوں کھکھلا کر ہنسنے لگتے۔ حامد اس کی باتیں نہ سمجھتا لیکن اس نہ سمجھنے میں اس کو لطف آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس کے ہونٹ چوم لیتا اور اس سے کہتا "یہ پیارے پیارے بول جو تم اپنے منہ سے نکال رہی ہو میرے منہ میں ڈال دو۔ میں انہیں پینا چاہتا ہوں"

وہ کچھ نہ سمجھتی اور ہنس دیتی۔ حامد اسے اپنے سینے کے ساتھ لگا لیتا۔ لتا کی باہیں بڑی سڈول اور گوری گوری تھیں۔ ان پر چولی کی چھوٹی چھوٹی آستینیں پھنسی ہوئی ہوتیں۔ حامد نے ان کو بھی کئی بار چوما۔ لتا کا ہر عضو حامد کو پیارا لگتا تھا۔

رات کو نو بجے جب حامد نے لتا کو اس کے گھر چھوڑا تو اپنے اندر ایک خلا سا محسوس کیا۔ اس کے ملائم جسم کا لمس جیسے ایک دم چھال کی طرح اتر کر اس سے جدا ہو گیا ہے۔ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح بالو ہرگو پال آئے۔ انہوں نے علیحدگی میں اس سے پوچھا "کیوں کیسی رہی؟"

حامد نے صرف اتنا کہا: "ٹھیک تھی"

"چلتے ہو پھر؟"

"نہیں مجھے ایک ضروری کام ہے"

"بکواس نہ کرو ——— میں نے تم سے آتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ دس دن تم میرے ہو"

حامد نے بابو ہرگوپال کو یقین دلایا کہ اسے واقعی بہت ضروری کام ہے پونے جارہا ہے۔ وہاں اس کو ایک آدمی سے مل کر اپنا کام کرانا ہے۔ بابو ہرگوپال انجام کار مان گئے اور اکیلے عیاشی کرنے چلے گئے۔

حامد نے ٹیکسی لی۔ بینک سے روپے نکلوائے اور سیدھا لتا کے ہاں پہونچا۔ وہ اندر نہا رہی تھی۔ کمرے میں ایک مرد بیٹھا تھا، وہی جس نے پہلے دن کہا تھا "ابھی آتی ہے ——— نہا رہی تھی، کپڑے بدل رہی ہے۔ حامد نے اس سے کچھ دیر باتیں کیں اور سو کا ایک نوٹ اس کے حوالے کر دیا۔ لتا آئی پہلے سے بھی زیادہ صاف ستھری اور نکھری ہوئی۔ ہاتھ جوڑ کر اس نے پرنام کیا۔ حامد اٹھا اور اس مرد سے مخاطب ہوا: "میں چلتا ہوں۔ تم لے آؤ انہیں ——— وقت پر پہونچ جاؤں گا"

یہ کہہ کر وہ نیچے اتر گیا، لتا آئی اور حامد کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا لمس محسوس کر کے حامد کو بڑی راحت ہوئی۔ وہ اس کو وہیں ٹیکسی میں اپنے سینے کے ساتھ

بھینچ لیا مگر لتا نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

شام کے ساڑھے سات بجے تک وہ اس کے ساتھ رہی ــــــ جب اس کو گھر چھوڑا تو ایسا محسوس کیا کہ اس کے دل کی راحت اس سے جدا ہو گئی ہے۔ رات بھر وہ بے چین رہا۔ حامد شادی شدہ تھا چھوٹے چھوٹے دو بچّوں کا باپ تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ سخت حماقت کر رہا ہے۔ اگر اس کی بیوی کو پتہ چل گیا تو آفت برپا ہو جائے گی۔ ایک بار سلسلہ ہو گیا ٹھیک ہے، مگر یہ سلسلہ تو اب دراز ہونے کی طرف مائل ہے۔ اس نے عہد کر لیا کہ اب شیواجی پارک کا رخ نہیں کرے گا۔ مگر صبح دس بجے وہ پھر لتا کے ساتھ ہوٹل میں لیٹا تھا۔

پندرہ روز تک حامد بلا ناغہ لتا کے ہاں جاتا رہا ــــ اس کے بنک کے اکاؤنٹ میں سے دو ہزار روپے اڑ چکے تھے۔ کاروبار الگ اس کی غیر موجودگی کے باعث نقصان اٹھا رہا تھا۔ حامد کو اس کا کامل احساس تھا۔ مگر لتا اس کے دل و دماغ پر بری طرح چھا چکی تھی۔ لیکن حامد نے ہمت سے کام لیا اور ایک دم یہ سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس دوران میں بابو ہرگوپال اپنی میلی اور غلیظ عیاشیاں ختم کر کے لاہور واپس جا چکا تھا۔ حامد نے خود کو زبردستی اپنے کاروباری کاموں میں مصروف کر دیا اور لتا کو بھولنے کی کوشش کی۔

چار مہینے گزر گئے۔ حامد ثابت قدم رہا۔ لیکن ایک دن اتفاق سے اس کا

خالی بوتلیں خالی ڈبے

گزر رشید احمد پارک سے ہوا۔ حامد نے غیرارادی طور پر ٹیکسی والے سے کہا: "روک لو یہاں"۔ ٹیکسی رکی۔ حامد سوچنے لگا: "نہیں یہ ٹھیک نہیں ـــــ ٹیکسی والے سے کہو، چلے!" مگر دروازہ کھول کر وہ باہر نکلا اور اوپر چلا گیا۔

لتا آئی تو حامد نے دیکھا کہ وہ پہلے سے موٹی ہے۔ چھاتیاں زیادہ بڑی ہیں۔ چہرے پر گوشت بڑھ گیا ہے۔ حامد نے سو روپے دیئے اور اس کو ہوٹل میں لے گیا۔ یہاں اس کو جب معلوم ہوا کہ لتا حاملہ ہے تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ گھبرا کر اس سے پوچھا: "یہ ـــــ یہ حمل کس کا ہے؟"

لتا کچھ نہ سمجھی۔ حامد نے اس کو بڑی مشکل سے سمجھایا تو اس نے سر ہلا کر کہا: "ہم کو مالوم نہیں!"

حامد پسینہ پسینہ ہو گیا: "تمہیں بالکل معلوم نہیں؟"

لتا نے سر ہلایا: "نہیں"۔

حامد نے تھوک نگل کر پوچھا: "کہیں ـــــ میرا تو نہیں؟"

"وہ مالوم نہیں"۔

حامد نے مزید استفسار کیا۔ بہت سی باتیں کیں تو اسے معلوم ہوا کہ لتا کے لواحقین نے حمل گرانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے کوئی دوا اثر نہیں کرتی تھی۔ ایک دوا نے تو اسے بیمار کر دیا چنانچہ ایک مہینہ وہ بستر پر پڑی رہی۔ حامد نے بہت سوچا۔ ایک ہی بات اس کی سمجھ میں آئی کہ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کرے اور بہت

جلدی کرے کیونکہ بچے کی خاطر لتا کو گاؤں بھیجا جا رہا تھا

حامد نے اس کو گھر چھوڑا اور ایک ڈاکٹر کے پاس گیا جو اس کا دوست تھا۔ اس نے حامد سے کہا: "دیکھو یہ معاملہ بڑا خطرناک ہے۔ زندگی اور موت کا سوال درپیش ہوتا ہے۔"

حامد نے اس سے کہا: "یہاں میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ نطفہ یقیناً میرا ہے۔ میں نے اچھی طرح حساب لگایا ہے۔ اس سے بھی اچھی طرح دریافت کیا ہے خدا کے لیے آپ سوچئے میری پوزیشن کیا ہے ——— میری اولاد ——— میں تو یہ سوچتے ہی کانپ کانپ جاتا ہوں۔ آپ میری مدد نہیں کرینگے تو سوچتا سوچتا پاگل ہو جاؤں گا۔"

ڈاکٹر نے اس کو دوا دے دی۔ حامد نے لتا کو پہنچا دی۔ مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ حامد خوش خبری سننے کے لیے بے قرار تھا۔ مگر لتا نے اس سے کہا کہ اس پر پہلے بھی کسی دوا نے اثر نہیں کیا تھا۔ حامد بڑی مشکلوں سے ایک اور دوا لایا مگر یہ بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اب لتا کا پیٹ صاف نمایاں تھا۔ اس کے لواحقین اسے گاؤں بھیجنا چاہتے تھے لیکن حامد نے ان سے کہا: "نہیں ابھی ٹھہر جاؤ ——— میں کچھ اور بندوبست کرتا ہوں۔"

بندوبست کچھ بھی نہ ہوا۔ سوچ سوچ کر حامد کا دماغ عاجز آ گیا۔ کیا کرے کیا نہ کرے، کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا ——— بالو بہر گوپال پر سو سو لعنتیں بھیجتا تھا جس نے

آپ کو کوستا تھا کہ کیوں اس نے حماقت کی۔ یہ سوچتا تو لرز جاتا کہ اگر لڑکی پیدا ہوئی تو وہ بھی اپنی ماں کی طرح پیشہ کرے گی۔ ڈوب مرنے کی بات ہے۔

اس کو لتا سے نفرت ہو گئی۔ اس کا حسن اس کے دل میں اب پہلے سے جذبات پیدا نہ کرتا۔ غلطی سے اس کا ہاتھ لتا سے چھو جاتا تو اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ اس نے انگاروں میں ہاتھ جھونک دیا ہے۔ اس کو اب لتا کی کوئی ادا پسند نہیں تھی۔ اس کی زبردست خواہش تھی کہ وہ اس کا بچّہ جننے سے پہلے پہلے مر جائے۔ وہ اور مردوں کے پاس بھی جاتی رہی تھی۔ کیا اسے حامد ہی کا نطفہ قبول کرنا تھا؟"

حامد کے جی میں آئی کہ وہ اس کے سوتے ہوئے پیٹ میں چھرا بھونک دے یا کوئی ایسا حیلہ کرے کہ اس کا بچہ پیٹ ہی میں مر جائے۔ لتا بھی کافی فکرمند تھی۔ اس کی کبھی خواہش نہیں تھی کہ بچّہ ہو۔ اس کے علاوہ اس کو بہت بوجھ محسوس ہوتا تھا۔ شروع شروع میں تو اس کو الٹیوں نے نڈھال کر دیا تھا۔ اب ہر وقت اس کے پیٹ میں اینٹھن سی رہتی تھی مگر حامد سمجھتا تھا کہ وہ فکرمند نہیں ہے: "اور کچھ نہیں تو کم بخت میری حالت دیکھ کر ہی ترس کھا کر بچّہ ضائع کر دے!"

دوائیں چھوڑ کر ٹونے ٹوٹکے بھی کیے گئے بچہ اتنا ہٹ دھرم تھا اپنی جگہ پر قائم رہا۔ تھک ہار کر حامد نے لتا کو گاؤں جانے کی اجازت دیدی لیکن خود وہاں جا کر مکان دیکھ لیا۔ حساب کے مطابق بچّہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں پیدا ہونا تھا۔ حامد نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے کسی نہ کسی طرح مروا ڈالے گا۔ چنانچہ اس غرض سے اس نے

بمبئی کے ایک بہت بڑے دادا سے راہ و رسم پیدا کی، اس کو خوب کھلاتا پلاتا رہا۔ اس پر اس کا کافی روپیہ خرچ ہوا مگر حامد نے کوئی خیال نہ کیا۔

وقت آیا تو اس نے اپنی ساری اسکیم دادا کریم کو بتا دی۔ ایک ہزار روپے طے ہوئے۔ حامد نے فوراً دے دیے۔ دادا کریم نے کہا: "اتنا چھوٹا بچہ مجھ سے نہیں مارا جائے گا۔ میں لا کر تمہارے حوالے کر دوں گا۔ آگے تم جانو اور تمہارا کام۔ ویسے یہ راز میرے سینے میں دفن رہے گا۔ اس کی تم کچھ نہ فکر کرو۔"

حامد مان گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ بچے کو گاڑی کی پٹڑی پر رکھ دے گا۔ اپنے آپ کچلا جائے گا یا کسی اور ترکیب سے اس کو ختم کر دے گا ـــــ دادا کریم کو ساتھ لے کر وہ لتا کے گاؤں آ پہونچا۔ دادا کریم نے پتا لگایا کہ بچہ پندرہ روز ہوئے پیدا ہو چکا ہے۔ حامد کے دل میں وہ جذبہ پیدا ہوا جو اپنے پہلے لڑکے کی پیدائش پر اس کو محسوس ہوا تھا۔ مگر اس نے اس کو وہیں دبا دیا اور کریم سے کہا: "دیکھو آج رات یہ کام ہو جائے۔"

رات کے بارہ بجے ایک اجاڑ جگہ پر حامد کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب طوفان برپا تھا۔ وہ خود کو بڑی مشکلوں سے قاتل میں تبدیل کر چکا تھا۔ وہ پتھر جو اس کے سامنے پڑا تھا بچے کا سر کچلنے کے لیے کافی تھا۔ کئی بار اسے اٹھا کر وہ اس کے وزن کا اندازہ کر چکا تھا۔

ساڑھے بارہ ہوئے تو حامد کو قدموں کی آواز آئی۔ حامد کا دل اس زور سے

خالی بوتلیں خالی ڈبے

دھڑکنے لگا۔ جیسے سینے سے باہر آجائے گا۔ دادا کریم اندھیرے میں نمودار ہؤا۔ اس کے ہاتھوں میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔ پاس آ کر اس نے حامد کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں دیدی اور کہا "میرا کام ختم ہؤا ——— میں چلا"
یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ حامد بہت بُری طرح کانپ رہا تھا۔ بچّہ کپڑے کے اندر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ حامد نے اسے زمین پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر اپنے لرزے پر قابو پانے کی کوشش کی۔ جب یہ کچھ کم ہؤا۔ تو اس نے وزنی پتھر اٹھایا۔ ٹٹول کر سر دیکھا۔ پتھر زور سے ٹپکنے ہی والا تھا کہ اس نے سوچا "بچے کو ایک نظر دیکھ تو لوں۔ پتھر ایک طرف رکھ کر اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دیا سلائی نکالی اور ایک تیلی سلگائی۔ یہ اس کی انگلیوں ہی میں جل گئی۔ اس کی ہمّت نہ پڑی۔ کچھ دیر سوچا۔ دل مضبوط کیا۔ دیا سلائی کی تیلی جلائی۔ کپڑا اٹھایا۔ پہلے سرسری نظر سے پھر ایک دم غور سے دیکھا۔ تیلی بجھ گئی ——— یہ کس کی شکل تھی؟ ——— اس نے کہیں دیکھی تھی۔ کہاں؟ ——— کب؟

حامد نے جلدی جلدی ایک تیلی جلائی اور بچّے کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ایکدم اس کی آنکھوں کے سامنے اس مرد کا چہرہ آ گیا جس کے ساتھ لتا شیوا جی پارک میں رہتی تھی ——— بہت تیری ایسی کی تیسی ——— ہو بہو وہی شکل ——— وہی ناک نقشہ!
حامد نے بچّے کو وہیں چھوڑا اور قہقہے لگاتا چلا گیا۔

لائسنس

ابّو کوچوان بڑا چھیل چھبیلا تھا۔ اس کا ٹانگہ گھوڑا بھی شہر میں نمبر ون تھا۔ کبھی معمولی سواری نہیں بٹھاتا تھا۔ اسکے لگے بندھے گاہک تھے جن سے اس کو روزانہ دس پندرہ روپے وصول ہو جاتے تھے جو ابّو کے لیے کافی تھے دوسرے کوچوانوں کی طرح نشہ پانی کی اسے عادت نہیں تھی۔ لیکن صاف ستھرے کپڑے پہننے اور ہر وقت بانکا بنے رہنے کا اسے بے حد شوق تھا۔

جب اس کا ٹانگہ کسی سڑک پر سے گھنگھرو بجاتا گزرتا تو لوگوں کی آنکھیں خود بخود اس کی طرف جاتیں ——— وہ بانکا ابّو جا رہا ہے — دیکھو تو کس ٹھاٹ سے بیٹھا ہے۔ ذرا پگڑی دیکھو کیسی ترچھی بندھی ہے۔"

ابّو لوگوں کی نگاہوں سے یہ باتیں سنتا تو اس کی گردن میں ایک بڑا بانکا خم

پیدا ہوجاتا اور اس کے گھوڑے کی چال اور زیادہ پرکشش ہوجاتی۔ البڈ کے ہاتھوں نے گھوڑے کی باگیں کچھ اس انداز سے پکڑی ہوتی تھیں جیسے ان کو اسے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ گھوڑا اشاروں کے بغیر چلا جا رہا ہے۔ اس کو اپنے مالک کے حکم کی ضرورت نہیں۔ بعض وقت تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ البڈ اور اس کا گھوڑا اچپنی و دونوں ایک ہیں، بلکہ سارا تانگہ ایک ہستی ہے اور وہ ہستی البڈ کے سوا اور کون ہوسکتی تھی۔

وہ سواریاں جن کو البڈ قبول نہیں کرتا تھا دل ہی دل میں اس کو گالیاں دیتی تھیں۔ بعض بددعا بھی دیتی تھیں "خدا کرے اس کا گھمنڈ ٹوٹے ——— اس کا تانگہ گھوڑا کسی دریا میں جا گرے۔"

البڈ کے ہونٹوں پر جو ہلکی ہلکی مونچھوں کی چھاؤں میں رہتے تھے، خود اعتمادی کی مسکراہٹ ناچتی رہتی تھی۔ اس کو دیکھ کر کئی کوچوان جل بھن جاتے تھے۔ البڈ کی دیکھا دیکھی چند کوچوانوں نے ادھر ادھر سے قرض لے کر نئے تانگے بنوائے۔ ان کو پیتل کے ساز و سامان سے سجایا مگر پھر بھی البڈ کی سی شان پیدا نہ ہوسکی۔ ان کو وہ گاہک نصیب نہ ہوسکے جو البڈ کے اور اس کے تانگے گھوڑے کے شیدا تھے۔

ایک دن دوپہر کو البڈ درخت کی چھاؤں میں تانگے پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ ایک آواز اس کے کانوں میں بھنبھنائی۔ البڈ نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ایک عورت تانگے کے بم کے پاس کھڑی تھی۔ البڈ نے اسے بمشکل ایک نظر دیکھا مگر اس کی تیکھی جوانی

ایک دم اس کے دل میں کھب گئی۔ وہ عورت نہیں جوان لڑکی تھی۔ سولہ سترہ برس کی۔ دُبلی پتلی لیکن مضبوط، رنگ سانولا مگر چمکیلا۔ کانوں میں چاندی کی چھوٹی چھوٹی بالیاں۔ سیدھی مانگ۔ ستواں ناک، اس کی پھُننگ پر ایک چھوٹا سا چمکیلا تل —— لمبا کرُتہ اور نیلا لاچا۔ سر پہ چدریا۔

لڑکی نے کنواری آواز میں ابّو سے پوچھا: "ویرا۔ ٹیشن کا کیا لوگے؟"

ابّو کے ہونٹوں کی مسکراہٹ شرارت اختیار کر گئی: "کچھ نہیں۔"

لڑکی کے چہرے کی سلونا ہٹ سُرخی مائل ہو گئی: "کیا لوگے ٹیشن کا؟"

ابّو نے اس کو اپنی نظروں میں سموتے ہوئے کہا: "تجھ سے کیا لینا ہے، بھاگ بھریے —— چل آ بیٹھ ٹانگے میں۔"

لڑکی نے گھبراتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے مضبوط سینے کو ڈھانکا حالانکہ وہ ڈھکا ہوا تھا: "کیسی باتیں کرتے ہو تم؟"

ابّو مسکرایا: "چل آ، اب بیٹھ بھی جا —— لے لیں گے جو تو دیدیگی۔"

لڑکی نے کچھ دیر سوچا، پھر پائدان پر پاؤں رکھ کر ٹانگے میں بیٹھ گئی: "جلدی لے چل ٹیشن۔"

ابّو نے پیچھے مڑ کر دیکھا: "بڑی جلدی ہے تجھے سوہنیے!"

"ہائے ہائے۔ تو تو ......" لڑکی کچھ اور کہتے کہتے رُک گئی۔

ٹانگہ چل پڑا —— اور چلتا رہا —— کئی سڑکیں گھوڑے کے سُموں کے

نیچے سے نکل گئیں۔ لڑکی سہمی بیٹھی تھی۔ الو کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ جب بہت دیر ہو گئی تو لڑکی نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا: "ٹیشن نہیں آیا ابھی تک؟"

الو نے معنی خیز انداز میں جواب دیا: "آجائے گا ۔۔۔ تیرا میرا ٹیشن ایک ہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

الو نے پلٹ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا "الہڑ ہے ۔۔۔ کیا تو اتنا بھی نہیں سمجھی، تیرا میرا ٹیشن ایک ہی ہے۔ اسی وقت ایک ہو گیا تھا جب الو نے تیری طرف دیکھا تھا ۔۔۔۔ تیری جان کی قسم تیرا غلام جھوٹ نہیں بولتا۔"

لڑکی نے سر پر پلو ٹھیک کیا۔ اس کی آنکھیں صاف بتا رہی تھیں کہ وہ الو کا مطلب سمجھ چکی ہے۔ اس کے چہرے سے اس بات کا بھی پتہ چلتا تھا کہ اس نے الو کی بات کا بُرا نہیں مانا۔ لیکن وہ اس کش مکش میں تھی کہ دونوں کا ٹیشن ایک ہو یا نہ ہو۔ الو بانکا سجیلا تو ہے لیکن کیا وفادار بھی ہے۔ کیا وہ اپنا ٹیشن چھوڑ دے جہاں اس کی گاڑی پتا نہیں کب کی جا چکی تھی۔

الو کی آواز نے اس کو چونکا دیا: "کیا سوچ رہی ہے بھاگ بھریئے؟"

گھوڑا مست خرامی سے ڈُلکی چل رہا تھا۔ ہوا خنک تھی۔ سڑک کے دو رویہ اُگے ہوئے درخت بھاگ رہے تھے۔ ان کی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں۔ گھنگھروں کے آہنگ اور جھنجھناہٹ کے سوا اور کوئی آواز نہیں تھی۔ الو گردن موڑے لڑکی

کے سانولے حسن کو دل ہی دل میں چوم رہا تھا ـــــ کچھ دیر کے بعد اس نے گھوڑے کی باگیں جنگلے کی سلاخ کے ساتھ باندھ دیں اور اُچک کر پچھلی سیٹ پر لڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ خاموش رہی۔ ابّو نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے : "میرے دیے اپنی باگیں میرے ہاتھ میں"

لڑکی نے صرف اتنا کہا: "چھوڑ بھی دیے" لیکن وہ فوراً ہی ابّو کے بازوؤں میں تھی۔ اُس کے بعد اُس نے مزاحمت نہ کی۔ اس کا دل البتہ زور زور سے پھڑپھڑا رہا تھا جیسے خود کو چھڑا کر اُڑ جانا چاہتا ہے۔

ابّو ہولے ہولے پیار بھرے لہجے میں اسے کہنے لگا: "یہ تانگہ گھوڑا مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا، لیکن قسم گیارہویں والے پیر کی یہ بیچ دوں گا اور تیرے لیے سونے کے کڑے بنواؤں گا ـــــ آپ پھٹے پرانے کپڑے پہنوں گا، لیکن تجھے شہزادی بنا کر رکھوں گا۔ قسم وحدہٗ لاشریک کی، زندگی میں یہ میرا پہلا پیار ہے ـــــ "تم میری نہ بنیں تو میں تیرے سامنے گلا کاٹ لوں گا اپنا" پھر اس نے لڑکی کو اپنے سے علیٰحدہ کر دیا: "جانے کیا ہو گیا ہے مجھے ـــــ چلو تمہیں ٹیشن چھوڑ آؤں"

لڑکی نے ہولے سے کہا: "نہیں ـــــ اب تم مجھے ہاتھ لگا چکے ہو"

ابّو کی گردن جھک گئی: "مجھے معاف کر دو، مجھ سے غلطی ہوئی"

"نبھاؤ گے اس غلطی کو؟"

خالی بوتلیں خالی ڈبے

لڑکی کے لہجے میں چیلنج تھا، جیسے کسی نے الّو سے کہا ہو: "لیجاؤ گے اپنا تانگہ اس تانگے سے آگے نکال کے"! اس کا جھکا ہوا سر اٹھا، آنکھیں چمک اٹھیں "بھاگ بھریے ——" یہ کہہ کر اس نے اپنے مضبوط سینے پر ہاتھ رکھا "الّو اپنی جان دیدے گا"

لڑکی نے اپنا ہاتھ بڑھایا: "تو یہ ہے میرا ہاتھ"

الّو نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا: "قسم اپنی جوانی کی۔ الّو تیرا غلام ہے"

دوسرے روز الّو اور اس لڑکی کا نکاح ہو گیا۔ وہ ضلع گجرات کی موچن تھی نام اس کا عنایت یعنی نیتی تھا۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ آئی تھی۔ وہ اسٹیشن پر اس کا انتظار کر رہے تھے کہ الّو اور اس کی مڈبھیڑ ہو گئی جو فوراً آہی محبت کی ساری منزلیں طے کر گئی۔ دونوں بہت خوش تھے۔ الّو نے تانگہ گھوڑا بیچ کر نیتی کے لیے سونے کے کڑے نہیں بنوائے تھے لیکن اپنے جمع کیے ہوئے پیسوں سے اس کو سونے کی بالیاں خرید دی تھیں۔ کئی ریشمی کپڑے بھی بنوا دیے تھے۔

لس لس کرتے ہوئے ریشمی لاچے میں جب نیتی، الّو کے سامنے آتی تو اس کا دل ناچنے لگتا: "قسم پنج تن پاک کی، دنیا میں تجھ جیسا سندر اور کوئی نہیں" اور یہ کہہ کر وہ اس کو اپنے سینے کے ساتھ لگا لیتا: "تو میرے دل کی رانی ہے"

دونو جوانی کی مستیوں میں غرق تھے۔ گاتے تھے، ہنستے تھے، سیریں کرتے تھے، ایک دوسرے کی بلائیں لیتے تھے۔ ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا کہ دفعتہً ایک روز

پولیس نے ابّو کو گرفتار کر لیا۔ نیتی بھی پکڑی گئی۔ ابّو پر اغوا کا مقدمہ چلا۔ نیتی ثابت قدم رہی لیکن پھر بھی ابّو کو دو برس کی سزا ہو گئی جب عدالت نے حکم سنایا تو نیتی ابّو کے ساتھ لپٹ گئی۔ روتے ہوئے اس نے صرف اتنا کہا: "میں اپنے ماں باپ کے پاس کبھی نہیں جاؤں گی ــــــ گھر بیٹھ کر تیرا انتظار کروں گی۔"

ابّو نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی: "جیتی رہ ــــــ تانگہ گھوڑا میں نے دینے کے سپرد کیا ہوا ہے ــــــ اس سے کرایہ وصول کرتی رہنا۔"

نیتی کے ماں باپ نے بہت زور لگایا مگر وہ ان کے ساتھ نہ گئی تھک ہار کر انہوں نے اس کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ نیتی اکیلی رہنے لگی۔ دینا اسے شام کو پانچ روپے دے جاتا تھا جو اس کے خرچ کے لیے کافی تھے۔ اس کے علاوہ مقدمے کے دوران میں روزانہ پانچ روپے کے حساب سے جو کچھ جمع ہوا تھا وہ بھی اس کے پاس تھا۔

ہفتے میں ایک بار نیتی اور ابّو کی ملاقات جیل میں ہوتی تھی جو کہ ان دونوں کے لیے بہت ہی مختصر تھی۔ نیتی کے پاس جتنی جمع پونجی تھی وہ ابّو کو آسائشیں پہنچانے میں صرف ہو گئی۔ ایک ملاقات میں ابّو نے نیتی کے ننگے کانوں کی طرف دیکھا اور پوچھا: "بالیاں کہاں گئیں نیتی؟"

نیتی مسکرا دی اور سنتری کی طرف دیکھ کر ابّو سے کہا: "گم ہو گئیں کہیں۔"

ابّو نے قدرے غصے ہو کر کہا: "تم میرا اتنا خیال رکھا نہ کرو ــــــ جیسا بھی

"ہوں، ٹھیک ہوں"

نیتی نے کچھ نہ کہا۔ وقت پورا ہو چکا تھا۔ مسکراتی ہوئی وہاں سے چل دی۔ مگر گھر جا کر بہت روئی۔ گھنٹوں آنسو بہائے، کیونکہ البو کی صحت بہت گر رہی تھی۔ اس ملاقات میں تو وہ اسے پہچان نہیں سکی تھی۔ گرانڈیل البو اب گھل گھل کر آدھا ہو گیا تھا۔ نیتی سوچتی تھی کہ اس کو اس کا غم کھا رہا ہے۔ اس کی جدائی نے البو کی یہ حالت کر دی ہے۔ لیکن اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ دق کا مریض ہے اور یہ مرض اسے ورثے میں ملا ہے۔ البو کا باپ البو سے کہیں زیادہ گرانڈیل تھا لیکن دق نے اسے چند دنوں ہی میں قبر کے اندر پہنچا دیا۔ البو کا بڑا بھائی کڑیل جوان تھا مگر عین جوانی میں اس مرض نے اسے دبوچ لیا۔ خود البو اس حقیقت سے غافل تھا چنانچہ جیل کے ہسپتال میں جب کہ وہ آخری سانس لے رہا تھا، اس نے افسوس بھرے لہجے میں نیتی سے کہا: "مجھے معلوم ہوتا کہ میں اتنی جلدی مر جاؤں گا تو قسم وحدہٗ لاشریک کی تجھے کبھی اپنی بیوی نہ بناتا ——— میں نے تیرے ساتھ بہت ظلم کیا ——— مجھے معاف کر دے ——— اور دیکھ میری ایک نشانی ہے، میرا تانگہ گھوڑا ——— اس کا خیال رکھنا ——— اور چنّی بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنا، البو نے تجھے پیار بھیجا ہے۔"

البو مر گیا ——— نیتی کا سب کچھ مر گیا، مگر وہ حوصلے والی عورت تھی۔ اس صدمے کو اس نے برداشت کر ہی لیا۔ گھر میں تن تنہا پڑی رہتی تھی۔ شام کو دینا آتا

تھا اور اسے دم دلاسا دیتا تھا اور کہتا تھا: "کچھ فکر نہ کرو بھابھی! اللہ میاں کے آگے کسی کی پیش نہیں چلتی ــــ ابّو میرا بھائی تھا ــــ مجھ سے جو ہو سکتا ہے خدا کے حکم سے کر دوں گا!"

شروع شروع میں تو نیتی نہ سمجھی پر جب اس کے عدّت کے دن پورے ہوئے تو دینے نے صاف لفظوں میں کہا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔ یہ سنکر نیتی کے جی میں آئی کہ وہ اس کو دھکا دے کر باہر نکال دے مگر اس نے صرف اتنا کہا۔ "بھائی مجھے شادی نہیں کرنی!"

اس دن سے دینے کے رویے میں فرق آ گیا۔ پہلے شام کو بلا ناغہ پانچ روپے ادا کرتا تھا۔ اب کبھی چار دینے لگا، کبھی تین۔ بہانہ یہ کہ بہت مندا ہے پھر دو دو تین تین دن غائب رہنے لگا بہانہ یہ کہ بیمار تھا یا ٹانگے کا کوئی کل پُرزہ خراب ہو گیا تھا اس لیے جو نہ سکا جب پانی سر سے نکل گیا تو نیتی نے دینے سے کہا۔ "بھائی دینے اب تم تکلیف نہ کرو، ٹانگہ گھوڑا میرے حوالے کر دو!"

بڑی لیت و لعل کے بعد بالآخر دینے نے بادل ناخواستہ ٹانگا گھوڑا نیتی کی تحویل میں دے دیا۔ اس نے ماجھے کے سپرد کر دیا جو ابّو کا دوست تھا اس نے بھی کچھ دنوں کے بعد شادی کی درخواست کی۔ نیتی نے انکار کیا تو اس کی آنکھیں بدل گئیں۔ ہمدردی وغیرہ سب ہوا ہو گئی۔ نیتی نے اس سے ٹانگا گھوڑا واپس لیا اور ایک انجانے کوچوان کے حوالے کر دیا۔ اس نے تو حد ہی کر دی۔ ایک شام

پیسے دینے آیا تو شراب میں دھت تھا۔ ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی نیتی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ نیتی نے اس کو خوب سنائیں اور کام سے ہٹا دیا۔

آٹھ دس روز تانگہ گھوڑا بیکار طویلے میں پڑا رہا۔ گھاس دانے کا خرچ علیحدہ، طویلے کا کرایہ علیحدہ۔ نیتی عجیب الجھن میں گرفتار تھی۔ کوئی شادی کی درخواست کرتا تھا، کوئی اس کی عصمت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا تھا۔ کوئی پیسے مار لیتا تھا۔ باہر نکلتی تھی تو لوگ بُری نگاہوں سے گھورتے تھے۔ ایک رات اس کا ہمسایہ دیوار پھاند کے آ گیا اور دراز دستی کرنے لگا۔ نیتی سوچ سوچ کر پاگل ہو گئی کہ کیا کرے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے اسے خیال آیا: کیوں نہ تانگہ میں آپ ہی جوتوں ——
آپ ہی چلاؤں —— ابّو کے ساتھ جب وہ سیر کو جایا کرتی تھی تو تانگہ خود ہی چلایا کرتی تھی۔ شہر کے راستوں سے بھی واقف تھی لیکن پھر اس نے سوچا: "لوگ کیا کہیں گے؟" —— اس کے جواب میں اس کے دماغ نے کئی دلیلیں دیں: "کیا حرج ہے —— کیا عورتیں محنت مزدوری نہیں کرتیں —— یہ کوئلے والیاں —— یہ دفتروں میں جانے والی عورتیں —— گھر میں بیٹھ کر کام کرنے والیاں تو ہزاروں ہوں گی —— پیٹ کسی حیلے سے پالنا ہی ہے!"

نیتی نے کچھ دن سوچ بچار کیا۔ آخر میں فیصلہ کر لیا کہ وہ تانگہ خود چلائے گی۔ اس کو خود پر پورا اعتماد تھا، چنانچہ اللہ کا نام لے کر وہ طویلے پہنچ گئی —— تانگہ جوتنے لگی تو سارے کوچوان ہکا بکا رہ گئے۔ بعض مذاق سمجھ کر خوب

ہنسے۔ جو بزرگ تھے انھوں نے نیتی کو سمجھایا کہ دیکھو ایسا نہ کر۔ یہ مناسب نہیں، مگر نیتی نہ مانی۔ ٹانگہ ٹھیک ٹھاک کیا۔ پیتل کا ساز و سامان اچھی طرح چمکایا گھوڑے کو خوب پیار کیا اور البو سے دل ہی دل میں پیار کی باتیں کرتی طبیلے سے باہر نکل گئی۔ کوچوان حیرت زدہ تھے، کیونکہ نیتی کے ہاتھ رواں تھے جیسے وہ ٹانگہ چلانے کے فن پر حاوی ہے۔

شہر میں ایک تہلکہ برپا ہو گیا کہ ایک خوبصورت عورت ٹانگہ چلا رہی ہے، ہر جگہ اسی بات کا چرچا تھا۔ لوگ سنتے تھے تو اس وقت کا انتظار کرتے تھے جب وہ ان کی سڑک پر سے گزرے گا۔

شروع شروع میں تو مرد سواریاں جھجکتی تھیں مگر یہ جھجک تھوڑی دیر میں دور ہو گئی اور خوب آمدن ہونے لگی۔ ایک منٹ کے لیے بھی نیتی کا ٹانگہ بیکار نہ رہتا تھا۔ ادھر سواری اتری ادھر بیٹھی۔ آپس میں کبھی کبھی سواریوں کی لڑائی بھی ہو جاتی تھی۔ اس بات پر نیتی کو پہلے کس نے بلایا تھا۔

جب کام زیادہ ہو گیا تو نیتی نے ٹانگہ جوتنے کے اوقات مقرر کر دیے۔ صبح سات بجے سے بارہ بجے، دوپہر دو سے چھ بجے تک ــــ یہ سلسلہ بڑا آرام دہ ثابت ہوا۔ چنی بھی خوش تھا۔ مگر نیتی محسوس کر رہی تھی کہ اکثر لوگ صرف اس کی قربت حاصل کرنے کے لیے اس کے ٹانگے میں بیٹھتے۔ بے مطلب، بے مقصد اسے ادھر ادھر پھراتے تھے۔ آپس میں گندے گندے

مذاق بھی کرتے تھے۔ صرف اس کو سنانے کے لیے باتیں کرتے تھے۔ اس کو ایسا لگتا تھا کہ وہ تو خود کو نہیں بیچتی لیکن لوگ چپکے چپکے اسے خرید رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ شہر کے سارے کوچوان اس کو بُرا سمجھتے ہیں۔ ان تمام احساسات کے باوجود وہ مضطرب نہیں تھی۔ اپنی خود اعتمادی کے باعث وہ پُرسکون تھی۔

ایک دن کمیٹی والوں نے نیتی کو بلایا اور اس کا لائسنس ضبط کر لیا۔ وجہ یہ بتائی کہ عورت ٹانگہ نہیں چلا سکتی۔ نیتی نے پوچھا "جناب، عورت ٹانگہ کیوں نہیں چلا سکتی؟"

جواب ملا "بس، نہیں چلا سکتی۔ تمہارا لائسنس ضبط ہے۔"

نیتی نے کہا "حضور، آپ گھوڑا ٹانگہ بھی ضبط کر لیں، پر مجھے یہ تو بتائیں کہ عورت کیوں ٹانگہ نہیں جوت سکتی۔ عورتیں چرخہ چلا کر اپنا پیٹ پال سکتی ہیں، عورتیں ٹوکری ڈھو کر روزی کما سکتی ہیں۔ عورتیں لینوں پر کوئلے چن چن کر اپنی روٹی پیدا کر سکتی ہیں ——— میں ٹانگہ کیوں نہیں چلا سکتی مجھے اور کچھ آتا ہی نہیں ——— ٹانگہ گھوڑا میرے خوند کا ہے ——— میں اسے کیوں نہیں چلا سکتی۔ میں اپنا گزارہ کیسے کروں گی؟ ——— حضور آپ رحم کریں۔ محنت مزدوری سے کیوں روکتے ہیں مجھے؟ ——— میں کیا کروں، بتائیے مجھے۔"

افسر نے جواب دیا "جاؤ بازار میں جا کر بیٹھو ——— وہاں زیادہ کمائی ہے۔"

یہ سن کر نیتی کے اندر جو اصل نیتی تھی جل کر راکھ ہو گئی ـــــ ہولے سے "اچھا جی" کہہ کر وہ چلی گئی۔ اونے پونے داموں تانگہ گھوڑا بیچا اور سیدھی ابو کی قبر پر گئی۔ ایک لحظے کے لیے خاموش کھڑی رہی۔ اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں جیسے بارش کے بعد چلچلاتی دھوپ نے زمین کی ساری نمی چوس لی تھی۔ اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ وا ہوئے اور وہ قبر سے مخاطب ہوئی: "ابو ـــــ تیری نیتی آج کمیٹی کے دفتر میں مر گئی"

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ دوسرے دن عرضی دی ـــــ اس کو اپنا جسم بیچنے کا لائسنس مل گیا۔

کتاب کا خلاصہ

سردیوں میں انور ممٹی پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ اس کا چھوٹا بھانجا اس کے ساتھ تھا چونکہ انور کے والد کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور وہ دیر سے واپس آنے والے تھے اس لیے وہ پوری آزادی اور بڑی بے پروائی سے پتنگ بازی میں مشغول تھا۔ پیچ ڈھیل کا تھا۔ انور بڑے زوروں سے اپنی مانگ پائی پتنگ کو ڈور پلا رہا تھا۔ اس کے بھانجے نے جس کا چھوٹا سا دل دھک دھک کر رہا تھا، اور جس کی آنکھیں آسمان پر جمی ہوئی تھیں انور سے کہا "ماموں جان کھینچ کے پیٹا کاٹ لیجئے" مگر وہ دھڑا دھڑ ڈور پلاتا رہا۔

نیچے کھلے کوٹھے پر انور کی بہن سہیلیوں کے ساتھ دھوپ سینک رہی تھی سب کشیدہ کاری میں مصروف تھیں، ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتی جاتی تھیں، انور کی

بہن شمیم انور سے دو برس بڑی تھی۔ کشیدہ کاری اور سینے پرونے کے کام میں ماہر۔ اسی لیے گلی کی اکثر لڑکیاں اس کے پاس آتی تھیں اور گھنٹوں بیٹھی کام سیکھتی رہتی تھیں۔ ایک ہندو لڑکی جس کا نام بملا تھا بہت دور سے آتی تھی۔ اس کا گھر قریباً دو میل پرے تھا لیکن وہ ہر روز بڑی باقاعدگی سے آتی اور بڑے انہماک سے کشیدہ کاری کے نئے نئے ڈیزائن سیکھا کرتی تھی۔

بملا کا باپ سکول ماسٹر تھا۔ بملا ابھی چھوٹی بچی ہی تھی کہ اس کی ماں کا دیہانت ہو گیا۔ بملا کا باپ لالہ ہری چرن چاہتا تو بڑی آسانی سے دوسری شادی کر سکتا تھا مگر اس کو بملا کا خیال تھا۔ چنانچہ وہ رنڈوا ہی رہا اور بڑے پیار و محبت سے اپنی بچی کو پال پوس کر بڑا کیا۔ اب بملا سولہ برس کی تھی۔ سانولے رنگ کی دُبلی پتلی لڑکی۔ خاموش خاموش۔ بہت کم باتیں کرنے والی۔ بڑی شرمیلی۔ صبح دس بجے آتی۔ آپا شمیم کو پرنام کرتی اور اپنا تھیلا کھول کر کام میں مشغول ہو جاتی۔

انور اٹھارہ برس کا تھا۔ اس کو تمام لڑکیوں میں سے صرف سعیدہ سے ہلکی سی دل چسپی تھی۔ لیکن یہ ہلکی سی دل چسپی کوئی اور صورت اختیار نہیں کر سکی تھی اس لیے کہ اس کی بہن اس کو لڑکیوں میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اگر وہ کبھی ایک لمحے کے لیے ان کے پاس آ بیٹھتا تو آپا شمیم فوراً ہی اس کو حکم دیتیں "انور اٹھو، تمہارا یہاں کوئی کام نہیں" اور انور کو اس حکم کی فوراً ہی تعمیل کرنی پڑتی۔

بملا البتہ کبھی کبھی انور کو بلاتی تھی، تاکہ لینے کے لیے۔ اس نے شمیم سے کہا

ہوتا۔ گھر میں میرا جی نہیں لگتا۔ پتاجی باہر شطرنج کھیلنے چلے جاتے ہیں۔ میں اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ انور بھائی سے کہیئے، مجھے ناول دے دیا کریں پڑھنے کیلئے:

پہلے تو بملا، شمیم کے ذریعے سے ناول لیتی رہی پھر کچھ عرصے کے بعد اس نے براہِ راست انور سے مانگنے شروع کر دیئے۔ انور کو بملا بڑی عجیب و غریب لڑکی لگتی تھی یعنی ایسی جو بڑے غور سے دیکھنے پر دکھائی دیتی تھی۔ لڑکیوں کے جھرمٹ میں تو وہ بالکل غائب ہو جاتی تھی۔ بیٹھک میں جب وہ انور سے نیا ناول مانگنے آتی تو اس کو اس کی آمد کا اس وقت پتا چلتا جب وہ اس کے پاس آ کر اپنی دھیمی آواز میں کہتی۔ انور صاحب ——— "یہ لیجیے اپنا ناول ——— شکریہ!" ———

انور اس کی طرف دیکھتا۔ اس کے دماغ میں عجیب و غریب تشبیہ پھدک اٹھتی۔ یہ لڑکی تو ایسی ہے جیسے کسی کتاب کا خلاصہ۔"

بملا اور کوئی بات نہ کرتی۔ پرانا ناول واپس کر کے نیا ناول لیتی اور نمستے کر کے چلی جاتی۔ انور اس کے متعلق چند لمحات سوچتا، اس کے بعد وہ اس کے دماغ سے نکل جاتی۔ لیکن انور نے ایک بات ضرور محسوس کی تھی کہ بملا نے ایک دو بار اس سے کچھ کہنا چاہا تھا مگر کہتے کہتے رک گئی تھی۔ انور سوچتا "کیا کہنا چاہتی تھی مجھ سے؟" اس کا جواب اس کا دماغ یوں دیتا: کچھ بھی نہیں ——— مجھ سے وہ کیا کہنا چاہتی ہوگی بھلا؟

انور ممٹی پر پتنگ اڑا رہا تھا۔ پیچ ڈھیل کا تھا۔ خوب ڈور پلا رہا تھا۔ دفعتہً

خالی بوتلیں خالی ڈبے

اس کی بہن شمیم کی گھبرائی ہوئی آواز آئی "انور ـــــ انور ـــــ اباجی آگئے!"

انور کو اور کچھ نہ سوجھا۔ ہاتھ سے ڈور توڑی اور مٹی پر سے نیچے کود پڑا۔ وہ کانٹا، وہ کاٹا کا شور بلند ہوا۔ انور کا گھٹنا بڑے زور وں سے چھل گیا تھا۔ ایک اس کو اس کا دکھ تھا۔ اِس پر اُس کے حریف فاتحانہ نعرے لگا رہے تھے۔ لنگڑاتا لنگڑاتا چارپائی پر بیٹھ گیا۔ گھٹنے کو دیکھا تو اس میں سے خون بہہ رہا تھا۔ بہلا سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا دوپٹہ اُتارا، کنارے پر سے تھوڑا سا پھاڑا اور پٹی بنا کر انور کے گھٹنے پر باندھ دیا۔ انور اس وقت اپنے پتنگ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ میدان اس کے ہاتھ رہے گا لیکن اس کے باپ کی بے وقت آمد نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اتنے بڑھے ہوئے پتنگ کا خاتمہ کر دے۔ حریفوں کے نعرے ابھی تک گونج رہے تھے۔ اس نے غصہ آمیز آواز میں اپنی بہن سے کہا: "اباجی کو بھی اسی وقت آنا تھا!"

شمیم مسکرائی: "وہ کب آئے ہیں۔"

انور چلایا: "کیا کہا؟"

شمیم ہنسی: "میں نے تم سے مذاق کیا تھا!"

انور برس پڑا: "میرا بیڑا غرق کرا کے آپ ہنس رہی ہیں ـــــ اچھا مذاق ہے۔ ایک میرا اتنا بڑھا ہوا پتنگ غارت ہوا۔ لوگوں کے آوازے سنے ـــ اور گھٹنا الگ زخمی ہوا!"

یہ کہہ کر انور نے اپنے گھٹنے کی طرف دیکھا۔ سفید ململ کی پٹی بندھی تھی۔ اب اس کو یہ یاد آیا کہ ـــــ ببو نے اپنا دوپٹہ پھاڑ کے اس کے پٹی باندھی تھی۔ اس نے شکر گزار آنکھوں سے ببلا کو دیکھا اور اس کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس کے زخم کے درد کو محسوس کر رہی ہے۔

ببلا شمیم سے مخاطب ہوئی: "آپا آپ نے بہت ظلم کیا ـــــ زیادہ چوٹ آجاتی تو ـــــ" وہ کچھ اور کہتے کہتے رک گئی اور کشیدہ کاڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

انور کی نگاہ ببلا سے ہٹ کر سعیدہ پر پڑی۔ سفید ٹول اوڑھے وہ اسے بہت بھلی معلوم ہوئی۔ انور اس سے مخاطب ہوا: "سعیدہ تم ہی بتاؤ یہ مذاق اچھا تھا ـــــ ہنسی میں پھنسی ہو جاتی تو؟"

شمیم نے اسے ڈانٹ دیا: "جاؤ انور تمہارا یہاں کوئی کام نہیں۔"

انور نے ایک نگاہ سعیدہ پر ڈالی، "بہت اچھا" کہہ کر اٹھا اور لنگڑاتا لنگڑاتا پھر ممٹی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر پتنگ اڑائے۔ غصے ہی غصے میں کھینچ کے ہاتھ مار کر قریباً ایک درجن پتنگ کاٹے اور نیچے اتر آیا۔ گھٹنے میں درد تھا۔ بیٹھک میں صوفے پر لیٹ گیا اور اوپر کمبل ڈال لیا۔ تھوڑی دیر اپنی فتوحات کے متعلق سوچا اور سو گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اس کو آواز سنائی دی جیسے کوئی اسے بلا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ دیکھا، سامنے ببلا کھڑی تھی۔ مرجھائی ہوئی، کچھ سمٹی ہوئی

خالی بوتلیں خالی ڈبے

سی انور نے لیٹے لیٹے پوچھا "کیا ہے بلا؟"

"جی، میں آپ سے کچھ ——" بلا رک گئی "جی میں آپ سے کوئی —— نئی کتاب —— کوئی نئی کتاب دیجئے"

انور نے کہا "میرے گھٹنے میں زوروں کا درد ہے —— وہ جو سامنے الماری ہے، اسے کھول کر جو کتاب تمہیں پسند ہو لے لو"

بلا چند لمحات کھڑی رہی، پھر چونکی "جی"

انور نے اس کو غور سے دیکھا۔ اس دوپٹے کے پیچھے جس میں سے بلا نے پٹی چھاڑی تھی بڑی مریل قسم کی چھاتیاں دھڑک رہی تھیں۔ انور کو اس پر ترس آیا۔ اس کی شکل و صورت، اس کے خدوخال سب کچھ اس قسم کے تھے کہ اس کو دیکھ کر انور کے دل و دماغ میں ہمیشہ رحم کے جذبات پیدا ہوتے تھے۔ اس کو اور کچھ نہ سوجھا۔ یہ کہا "پٹی باندھنے کا شکریہ!"

بلا نے کچھ کہے بغیر الماری کا رخ کیا اور اسے کھول کر کتابیں دیکھنے لگی۔ انور کے دماغ میں وہ تشبیہ پھر پھدکی "یہ کتاب نہیں، کتاب کا خلاصہ ہے —— بہت سی ردی کاغذوں پہ چھپا ہوا!"

بلا نے ایک بار انور کو انکھیوں سے دیکھا مگر جب اسے متوجہ پایا تو اس کی طرف پیٹھ کر لی کچھ دیر کتابیں دیکھیں۔ ایک منتخب کی، الماری کو بند کیا انور کے پاس آئی اور "میں یہ لے چلی ہوں" کہہ کر چلی گئی۔

کتاب کا خلاصہ

انور نے بملا کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی گر اس کو سعیدہ کے سفید پیلے اودر کا خیال آتا رہا ——— بل اور عمرہ پہنے ہوئے جسم کے خط کتنے واضح ہو جاتے ہیں ——— سعیدہ کا سینہ اور اس بملا کی مریل چھاتیاں ـــ جیسے ان کا دودھ الگ کر کے صرف پانی رہنے دیا گیا ہے ...... سعیدہ کے گھنگھریالے بال.... کم بخت نے اپنے ماتھے کے زخم کے نشان کو چھپانے کا کیا ڈھنگ نکالا ہے ——— بل کھاتی ہوئی ایک لٹ چھوڑ دیتی ہے اس پر ——— اور بملا ——— جانے کیا تکلیف ہے اسے ——— آج بھی کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ مگر مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے ——— شاید اس کا انداز ہی کچھ اسی قسم کا ہو ——— ہمیشہ کتاب اسی طرح مانگتی ہے جیسے کوئی مدد مانگ رہی ہے۔ کوئی سہارا ڈھونڈھ رہی ہے ——— سعیدہ ماشاءاللہ آج سفید پیلے اودر میں قیامت ڈھا رہی تھی ——— یہ قیامت ڈھانا کیا بکواس ہے ——— قیامت تو ہر چیز کا خاتمہ ہے اور سعیدہ تو ابھی میری زندگی میں شروع ہوئی ہے۔ بملا ——— بملا ——— بھئی میری سمجھ میں نہیں آئی یہ لڑکی ——— باپ تو اس کو بہت پیار کرتا ہے۔ اس کی خاطر اس نے دوسری شادی نہ کی ——— شاید ان کو کوئی مالی تکلیف ہو ——— لیکن گھر تو خاصا اچھا تھا ——— ایک ہی پلنگ تھا لیکن بڑا شاندار ——— صوفہ سیٹ بھی برا نہیں تھا اور جو کھانا میں نے کھایا تھا اس میں کوئی برائی نہیں تھی.... سعیدہ کا گھر تو بہت ہی امیرانہ ہے بڑے رئیس کی لڑکی ہے ——— اس ریاست کی الیی تیسی ——— یہی تو بہت بڑی مصیبت

ہے ورنہ..... لیکن چھوڑو جی ــــ سعیدہ جوان ہے کل کلاں بیاہ دی جائیگی ــــ مجھے خدا معلوم ابھی کتنے برس لگیں گے پوری تعلیم حاصل کرنے میں ــــ بی اے ــــ بی اے کے بعد ولایت ــــ سیم؟ ــــ دیکھیں گے! ــــ لیکن سفید پل اوور خوب تھا!"

انور کے دماغ میں اسی قسم کے مخلوط خیالات آتے رہے۔ اس کے بعد وہ دوسرے کاموں میں مشغول ہو گیا۔

دوسرے روز بملا نہ آئی مگر انور نے اس کی غیر حاضری کو کچھ زیادہ محسوس نہ کیا بس صرف اتنا دیکھا کہ وہ لڑکیوں کے جھرمٹ میں نہیں ہے ــــ شاید ہو، لیکن اگلے روز جب بملا آئی تو لڑکیوں نے اس سے پوچھا "بملا تم کل کیوں نہ آئیں؟"

بملا اور زیادہ مرجھائی ہوئی تھی، اور زیادہ مختصر ہو گئی تھی جیسے کسی نے منہ پیر کر اس کو سر طرف سے چھوٹا اور ہلکا کر دیا ہے۔ اس کا سانولا رنگ عجیب قسم کی دردناک زردی اختیار کر گیا تھا لڑکیوں کا سوال سن کر اس نے انور کی طرف دیکھا جو گملوں میں پانی دے رہا تھا اور تھیلا کھول کر چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کل پتاجی ــــ کل پتاجی بیمار تھے۔"

شمیم نے افسوس ظاہر کیا اور پوچھا "کیا تکلیف تھی انہیں؟"

بملا نے انور کی طرف دیکھا چونکہ وہ اس کو دیکھ رہا تھا اس لیے نگاہیں دوسری طرف کر لیں اور کہا "تکلیف ــــ معلوم نہیں کیا تکلیف تھی ــــ پھر بھیجے میں

ہاتھ ڈال کر اپنی چیزیں نکالیں: میں تو نہیں سمجھتی۔"

انور نے لوٹا منڈیر پر رکھا اور بملا سے مخاطب ہوا: "کسی ڈاکٹر سے مشورہ لیا ہوتا۔"

بملا نے انور کو بڑی تیز نگاہوں سے دیکھا "ان کا روگ ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

انور کو ایسا محسوس ہوا کہ بملا نے اس سے یہ کہا ہے "ان کا روگ تم سمجھ سکتے ہو" وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سعیدہ کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ وہ بملا سے کہہ رہی تھی "خالہ جان کے پاس جائیں، وہ بہت بڑے ڈاکٹر ہیں، یوں چٹکیوں میں سب کچھ بتا دیں گے۔"

سعیدہ نے چٹکی بجائی تھی مگر بجی نہیں تھی۔ انور نے اس سے کہا "سعیدہ تم سے چٹکی کبھی نہیں بجے گی۔ فضول کوشش نہ کیا کرو۔"

سعیدہ شرما گئی، آج کا پُل اوور سیاہ تھا۔ انور نے سوچا: "کمبخت پر ہر رنگ کھِلتا ہے —— لیکن کتنے پُل اوور ہیں اس کے پاس؟ —— ہر وقت کوئی نہ کوئی بنتی ہی رہتی ہے۔ سویٹروں اور پُل اووروں کا خبط ہے —— اس سے میری شادی ہو جائے تو مزے آ جائیں۔ پُل اوور ہی پُل اوور —— دوست یار خوب جلیں۔ لیکن یہ بملا کیوں آج راکھ کی ڈھیر سی لگتی ہے.... سعیدہ شرما گئی تھی —— یہ شرمانا مجھے اچھا نہیں لگتا —— چٹکی بجانا سیکھ لے مجھ سے —— مجھ سے نہیں تو کسی اور سے —— لیکن میں بہترین چٹکی بجانے والا ہوں۔"

یہ سب کچھ اس نے ایک سیکنڈ کے عرصے میں سوچا۔ سعیدہ نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ انور نے اس سے کہا "دیکھیے، چٹکی یوں بجایا کرتے ہیں" اور اس نے بڑے زور سے چٹکی بجائی۔ اتفاقاً اس کی نگاہ بملا پر پڑی۔ اس کے چہرے پر یاس کی مردنی طاری تھی۔ انور کے دل میں ہمدردی کے جذبات ابھر آئے "بملا تم پتاجی سے کہو کہ وہ کسی اچھے ڈاکٹر سے ضرور مشورہ لیں —— ان کے سوا تمہارا اور کون ہے؟" یہ سنکر بملا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ زور سے دونوں ہونٹ بھینچے اور انتہائی ضبط کے باوجود زار و قطار روتی، برساتی کی طرف دوڑ گئی۔ ساری لڑکیاں کام چھوڑ کر اس کی طرف بھاگیں۔ انور نے برساتی میں جانا مناسب نہ سمجھا اور نیچے بیٹھک میں چلا گیا۔ بملا کے بارے میں اس نے سوچنے کی کوشش کی مگر اس کے دماغ نے اس کی رہبری نہ کی۔ وہ بملا کے دُکھ درد کا صحیح تجزیہ نہ کر سکا۔ وہ صرف اتنا سوچ سکا کہ اس کو صرف اس بات کا غم ہے کہ اس کی ماں زندہ نہیں۔

شام کو انور نے اپنی بہن سے بملا کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا "معلوم نہیں کیا دُکھ ہے بیچاری کو —— اپنے باپ کا بار بار ذکر کرتی تھی کہ ان کو جانے کیا روگ ہے ...... بس!"

سعیدہ پاس کھڑی تھی۔ سیاہ پُل اوور پہنے۔ اس کی چلتی جاگتی چھاتیاں آبنوسی گولیوں کی صورت میں اس کے سفید نیون کے دوپٹے کے پیچھے بڑا دل کش تضاد پیدا کر رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے سیاہ بٹنوں پر ان کی چمک چھپانے کے لیے کسی

کتاب کا خلاصہ

مکڑی نے مہین سا جالا بُن دیا ہے انور بملا کا دکھ بھول گیا اور سعیدہ سے باتیں کرنے لگا۔ سعیدہ نے اس سے کوئی دلچسپی نہ لی اور آپا شمیم کو سلام کر کے چلی گئی۔

انور بیٹھک میں کالج کا کام کرنے بیٹھا تو اسے بملا کا خیال آیا کیسی لڑکی ہے؟ — کچھ سمجھ میں نہیں آتا — میرے پٹی باندھی — اپنا دوپٹہ پھاڑ کر۔ آج میں نے کہا، پتاجی کے سوا تمہارا کون ہے تو اس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا — اور جب میں گملوں میں پانی دے رہا تھا تو بملا کی اس بات سے کہ ان کا روگ ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آئے گا اس نے کیوں یہ محسوس کیا تھا کہ بملا نے اس کے بجائے اس سے یہ کہا ہے، ان کا روگ تم سمجھ سکتے ہو — لیکن میں کیسے سمجھ سکتا ہوں — کیا سمجھ سکتا ہوں — وہ مجھے ٹھیک طور پر سمجھاتی کیوں نہیں، یعنی اگر وہ کچھ سمجھانا ہی چاہتی ہے — میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا — جب اس نے میری طرف دیکھا تھا تو اس کی نگاہوں میں اتنی تیزی کیوں تھی — اب خیال کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ میری ذہانت و فراست پر لعنت بھیج رہی تھی — لیکن کیوں؟ — شاؤ جی...... سعیدہ — ہاں وہ سیاہ پلّو اور — سفید ننوں کا ہوائی دوپٹہ — اور.... لیکن مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیئے — جانے کس کا مال ہے... خیر کچھ بھی ہو خوبصورت لڑکی ہے — مگر اس پر خوبصورتی ختم تو نہیں ہو گئی"

لیکن اگلے روز بملا نہ آئی۔ انور کے گھر میں سب متفکر تھے۔ دعائیں کرتے تھے

کہ خدا اس کے باپ کو اس کے سر پر سلامت رکھے۔ شمیم کو بملا بے حد پسند تھی۔ اس لیے کہ وہ خاموشی پسند اور ذہین تھی۔ باریک سے باریک بات فوراً سمجھ جاتی تھی، چنانچہ وہ سارا دن وقفوں کے بعد اس کو یاد کرتی رہی۔ انور کی ماں نے تو انور سے کہا کہ وہ سائیکل پر جائے اور بملا کے باپ کی خیریت دریافت کر کے آئے۔

انور گیا ——— بملا ساگوان کے چوڑے پلنگ پر اوندھی لیٹی تھی، سانس کا اتار چڑھاؤ تیز تھا۔ انور نے ہولے سے پکارا تو کوئی ردِ عمل نہ ہوا۔ ذرا بلند آواز میں کہا "بملا" تو وہ چونکی۔ کروٹ بدل کر اس نے انور کو دیکھا۔ انور نے نمستے کی۔ بملا نے ہاتھ جوڑ کر اس کا جواب دیا۔ انور نے دیکھا کہ بملا کی آنکھیں میلی تھیں، جیسے وہ روتی رہی تھی اور اس نے اپنے آنسو خشک نہیں کیے تھے۔

پلنگ پر سے اٹھ کر اس نے انور کو کرسی پیش کی اور خود فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھ گئی۔ انور نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا: "وہاں سب کو بہت فکر تھی ——— پتا جی کہاں ہیں؟"

بملا کے مرجھائے ہوئے ہونٹ کھلے اور اس نے کھوکھلی آواز میں صرف اتنا کہا "پتا ——— !"

انور نے پوچھا: "طبیعت کیسی ہے ان کی"

"اچھی ہے:" ببلا کی آواز اس کی آواز نہیں تھی:"

"تم آج نہیں آئیں تو سب کو بڑی تشویش ہوئی ——— امی جان نے مجھ سے کہا، سائیکل پر جاؤ اور پتا لے کر آؤ ——— لالہ جی کہاں ہیں؟"

"شطرنج کھیلنے گئے ہیں:"

"تم آج کیوں نہیں آئیں؟"

"میں؟" یہ کہہ کر ببلا رک گئی۔ تھوڑے وقفے کے بعد بولی" میں اب نہیں آسکوں گی ——— مجھے ——— مجھے ایک کام مل گیا ہے:"

انور نے پوچھا: کیسا کام؟"

ببلا نے ایک آہ بھری: کل ہی معلوم ہوا ہے ——— جانے کیا ہے" یہ کہتے ہوئے وہ کانپی: ٹھیک ہے جو کچھ بھی ہے ٹھیک ہے" پھر وہ جیسے اپنے اندر ڈوب گئی:

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر انور نے اٹک کر پوچھا: میں ان سے کیا کہوں؟"

ببلا چونکی "کیا؟"

انور نے اپنے الفاظ دہرائے "میں ان سے کیا کہوں؟"

آور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ——— سب کو نستے!"

انور کرسی پر سے اٹھا۔ ہاتھ جوڑ کر ببلا کو نستے کی۔ ببلا نے اس کا جواب دیا، مگر انور کھڑا رہا۔ ببلا خلا میں دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد انور اس سے مخاطب

ہُوا: بملا ـــــ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ . . . . . . مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم نے مجھ سے کئی بار کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کہہ نہ سکیں ـــــ میں پوچھ سکتا ہوں؟"

بملا کے ہونٹوں پر ایک زخم خوردہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ انور اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔ بملا اٹھی۔ کھڑکی کے ساتھ لگ کر اس نے نیچے بڑی بدرو کی طرف دیکھا اور انور سے کہا "جو میں کہہ نہ سکی، تم سمجھ نہ سکے، اب کہنے اور سمجھنے سے بہت پرے چلا گیا ہے ـــــ تم جاؤ، میں سونا چاہتی ہوں۔"

انور چلا گیا ـــــ بملا پھر نہ آئی۔

قریباً دس مہینے بعد اخباروں میں یہ سنسنی پھیلانے والی خبر شائع ہوئی کہ بڑی سڑک کی بدرو میں ایک نوزائیدہ بچّہ مرا ہوا پایا گیا۔ تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ بچّہ لالہ ہری چرن سکول ماسٹر کی لڑکی بملا کا تھا اور بچے کا باپ خود لالہ ہری چرن تھا ـــــ سب پر سکتہ چھا گیا۔

انور نے سوچا۔ تو ساری کتاب کا خلاصہ یہ تھا:

شفیق الرحمٰن

"سارے نئے ادب میں لے دے کے ایک شفیق الرحمٰن ہیں جنھوں نے تفریحی ادب کی طرف توجہ کی ہے یہ شگفتگی، یہ لاابالی پن، یہ مچلتی ہوئی جگمگاہٹ بس انھی کا حصہ ہے"

محمد حسن عسکری

"شفیق الرحمٰن کے افسانے پڑھ کر شوخ رنگوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ سرخا سرخ، نارنجی، یاقوتی، زعفرانی"

کرشن چندر

"شفیق الرحمٰن موجودہ دور میں شگفتہ اور صحت مند ادب کے بانی ہیں"

ماہنامہ ادب لطیف

"شفیق الرحمٰن کی کہانیوں میں تکلف اور پیچیدگیاں نہیں ہوتیں۔ ان کے رومانی اور شگفتہ افسانوں میں بے ساختگی اور روانی ہوتی ہے"

حجاب امتیاز علی

شفیق الرحمٰن کے ہنستے مسکراتے رومانی افسانوں کے چار مجموعے

کرنیں	شگوفے	مد و جزر	پچھتاوے
۲.	۲ / ۵۰	۲ / ۰۰	۲ / ۵۰

البیان

چوک انارکلی ——— لاہور

اشفاق احمد

"اشفاق احمد اور عصمت چغتائی کے افسانوں میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے. عصمت کے کردار عام طور پر جارحانہ قسم کی منفی محبّت میں مبتلا رہتے ہیں جس کا انجام بڑا ہی اندوہناک ہوتا ہے. اشفاق کے کردار بڑی ہی نرم و نازک محبّت کرتے ہیں مگر انجام اس کا بھی بڑا دردناک ہوتا ہے. عصمت کے ہاں محبت کے نشان گھونسے، لاتیں، چٹکیاں اور تیکھی تیکھی چبھ جانے والی باتیں ہوتی ہیں اور اشفاق کے ہاں ہلکے ہلکے لمس اور چھوٹی موٹی سسکی اوائیں، ننھے منّے بوسے اور بڑی میٹھی میٹھی باتیں جیسے برفی کی ڈلیاں - دونوں کے ہاں پیمانہ محبّت ایک ہی ہے مگر اس میں شراب انڈیلنے کا طریقہ جدا گانہ ہے، عصمت چھلکاتی ہے، اشفاق ایک ایک قطرہ ڈال کر اسے لبالب بھرتا ہے —— اس کھیل میں دونوں کے جام ٹوٹ جاتے ہیں اور ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیوں عصمت کے کردار ایسے خطرناک کھیل میں محتاط نہ رہے؟ کیوں ایسے خطرناک کھیل میں اشفاق کے کردار اتنے محتاط رہے جب کہ انھیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ زیادہ احتیاط ہی اکثر شکست و ریخت کا موجب ہوتی ہے!" سعادت حسن منٹو

اشفاق احمد کے درد بھرے کرداروں کی تصویریں،

"ایک محبّت سو افسانے"

البیان —— چوک انار کلی لاہور

ماہنامہ
نُصرت

احساس کا چراغ
نیل کا تارہ

اب ایک نئے سفر کے لیے کمر باندھتا ہے۔

آج کی دُنیا یہ سمجھتی ہے کہ اسلام اور جدید علوم ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ نیا پڑھا لکھا طبقہ اسلام کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے اور علماء ہیں کہ نئی زندگی کے کسی بھی قالب کو قبول نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے علم اور وحی کو ہم آہنگ کر کے عمل کی مستقیم راہ کی تلاش ترک کر دی ہے۔ اب ہمارا عمل، وحی تو ایک طرف رہی، علم سے بھی بہرہ ور ہونے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بس جو ہمارے جی میں آتی ہے ہم کر گزرتے ہیں۔ اس سے بے راہ روی اور فساد نہیں پیدا ہوں گے تو اور کیا ہوگا۔ وحی، علم اور عمل اب ایسے متوازی خطوط بن گئے ہیں جو کہیں بھی نہیں ملتے۔ وحی کے مُنہ پر جزدان چڑھا دیا گیا ہے، علم ماہرین کا حصہ بن کر رہ گیا ہے اور عمل کے لیے نہ وحی کی ضرورت ہے نہ علم کی، بس پیسہ چاہیے اور چند ہتھکنڈے۔

یہ موت کا ایک بے مہار لمحہ ہے
لیکن ایسے لمحے اپنے اندر ایک نئی زندگی کا بیج بھی رکھتے ہیں!

یہ نئی زندگی وحی اور علم اور عمل کی ہم آہنگی ہی سے اُبھر سکتی ہے
آیئے مل جُل کر نئی زندگی کے لیے فضا ہموار کریں۔

تاکہ خدا کی زمین خدا کے نُور سے جگمگا اُٹھے

ماہنامہ نُصرت لاہور

مدیر حنیف رامے
فی شمارہ ...روپے سالانہ بیس رُوپے

KHALI BOATLAIN, KHALI DABBAY

زندہ کتابیں

١٩٦٥ء کے بہترین افسانے

انتخاب : سید قاسم محمود

اس مجموعے میں —— راجندر سنگھ بیدی ، کرشن چندر ، ا
قاسمی ، علی عباس حسینی ، آغا بابر ، حجاب امتیاز علی ،
مستور ، انتظار حسین ، مسعود مفتی ، بانو قدسیہ ، الطاف فاطمہ
خالدہ اصغر ، احسن فاروق ، عنایت‌اللہ اور شرون کمار ورما کے
منتخب افسانے شامل ہیں ۔ قیمت : **3.50**

شبنم

ناول : عزیز احمد

عزیز احمد اردو کے سب سے مشہور اور ممتاز ناول نگار ہیں ۔ انہیں ناول کی تکنیک پر پورا عبور حاصل ہے ۔ اپنے اس بلند پایہ اور دلچسپ ترین ناول میں عزیز احمد نے حسن ، عشق اور موت کی ازلی مثلث کے تمام زاویے پوری مہارت سے ماپ ماپ کر دکھائے ہیں ۔ قیمت : **3 00**

گریز

زاویے پہ میں

ناول : عزیز احمد

گریز کا ہیرو مستقبل کا انسان ہے جس کی آنکھیں نہ مشرق کو دیکھتی ہیں نہ مغرب کو بلکہ اس نئے افق پر مرکوز ہیں جہاں صبح کاذب کے دھندلکے کے سوا کچھ نہیں ۔ سیاحت ، ور سیاست ، حسن اور عشق — اس کا دل کہیں بھی تسکین نہیں پاتا ۔ قیمت : **3.00**

البیان ، چوک انارکلی ، لاہور

البیان کی مطبوعات آپ کے اعلیٰ ادبی ذوق کی آب کرتی ہیں